گوربخش سنگھ

بن بیاہی ماں

'بن بیاہی ماں' میرا وہ ناول ہے' جس نے
مجھ سے میرے کئی ہمدرد چھین لئے' کئی احباب
کے گھروں سے مجھے اور 'پریت لڑی' کو ہمیشہ کے
لئے بیدخل کر دیا۔ کئی ایسے اصحاب سے جو مجھے
شریف آدمی خیال کرتے تھے' بدمعاش کا لقب
دلایا لیکن 'بن بیاہی ماں' اور کچھ بھی نہیں ——
یہ میری روح ہے۔

——— گوربخش سنگھ

پرائیویٹ لمیٹڈ
جی۔ ٹی۔ روڈ
شاہدرہ دہلی ۳۲

(کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی)

بن بیاہی ماں

گوربخش سنگھ

BIN BIYAHI MAAN : NOVEL
GURBAKSH SINGH

قیمت ایک روپیہ

نویتج کے نام ـــــــ

جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ غلط قدروں کی
چٹان کے ساتھ ٹکر لینے سے گریز نہیں کرے گا۔

ـــــــ گوربخش سنگھ

پیش لفظ

میری کوئی کہانی یا ناول لوگوں کی نکتہ چینی کے بغیر نہیں پڑھا جاتا۔ کیونکہ میں آج تک اپنی یا دوسروں کی تفریح کے لئے کچھ نہیں لکھ سکا۔ میری تحریر کا ہر حصّہ غلط قدروں کے خلاف نمایاں یا پنہاں شکایت ہے —— میرا اعتقاد ہے کہ انسان کی قسمت میں سوائے اُس کی خود رائج کردہ غلط قدروں کے، دوسری کوئی بھی تکلیف دہ بات نہیں ہے۔ زندگی ہر شخص کے لئے —— کیا امیر اور کیا غریب سب کے لئے ایک دلچسپ حالت ہے۔ نہ تو زندگی سے قبل کوئی دُکھ

تھا اور نہ بعد میں کوئی مصیبت ہوگی۔ تمام مصائب کا جال انسان نے غلط قدروں کے غلط اندازوں سے خود بُنا ہے۔ انسان جب بھی اس جال کو توڑنے کی ہمّت اور جراُت کرے گا تب ہی اس کے لئے زندگی ایک لاثانی تخلیق بن سکے گی۔

لیکن 'بِن بیاہی ماں' میرا وہ ناول ہے جس نے مجھے کئی ہمدردوں کی ہمدردی سے محروم کر دیا ہے۔ کئی دوستوں کے گھروں سے مجھے اور پریت لڑی کو ہمیشہ کے لئے نکال دیا ہے۔ کئی ایسے احباب سے جن کے نزدیک میں ایک بہت شریف انسان تھا مجھے بدمعاش کا لقب دلایا ہے۔

اس ناول کا پانچواں ایڈیشن قارئین کے روبرو پیش کرتے ہوئے میں یہ جتانا نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ بے انصافی کی گئی ہے بلکہ میں اور بھی پُر زور الفاظ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو اس ناول سے زیادہ پاکیزہ خیال نہیں کرتا۔ اگر اس ناول کا اہم کردار ناقابلِ قبول ہے تو میں خود بھی ناقابلِ قبول رہنا منظور کرتا ہوں —— 'بِن بیاہی ماں' اور کچھ بھی نہیں —— یہ میری اپنی رُوح ہے۔ اِس کا گلِہ میرا اپنا گلہ ہے۔

قارئین نے غلط سمجھا ہے کہ میں نے کسی 'بن بیاہی ماں' کو مجلسی

نکتہ چینی کے لئے پیش کیا تھا، ہرگز نہیں، بلکہ میں نے ایک سنگ دِل سماج کو رائے عامہ کی عدالت میں اس کے کھوکھلے تکبّر کا پردہ چاک کرکے اُسے اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا تھا۔ میرے انجان ججوں نے بلا وجہ غلط تنقیحیں نکالنے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کیا ہے ——— 'بن بیاہی ماں' مجرم نہیں بلکہ وہ ایک مظلوم گواہ ہے جس کی بیش بہا اور پاکیزہ رُوح کو ایک ظالم مجرم نے اپنی رسوم کے خونیں تختۂ دار پر چڑھا کے بے عزّت اور مجروح کیا ہے۔

میں مظلوم کا وکیل ہوں ——— اور اپنی رُوح کی پُوری گہرائی سے اس کی حمائت کرتا ہوں۔ اگر یہ محض ایک ناول ہوتا تو مُصنّف اُسے مقبول عام بنانے کا تمنائی ہوتا اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ پربھا کی شادی کی رسم کسی پنڈت یا پروہت کے ہاتھوں ادا کرا دیتا۔ اور مجلسی بھِڑوں کے چھتّے چھیڑ کر ان کی ناراضی مُول نہ لیتا ——— لیکن یہ ناول نہیں ایک فریاد ہے۔ اس بے گناہ لیکن خود مختار رُوح کی فریاد جس کے اٹل فدائی اعتقاد کے متعلق ملحد برادری کُفر کا فتوے صادر کرتی ہے۔ جس کی بے داغ دیانت داری کو بددیانت لوگ 'فریب' کا نام دیتے ہیں۔ جس کی سادگی اور جس کے ضبط کو عیّاش لوگ عیش پرستی کہنے کی حماقت کرتے ہیں۔ جس کے سادہ لباس کو 'غیر ملکی لباس میں

ملبوس اور بیرے خانساموں کے ہاتھوں کھانا کھانے والے مغربی تہذیب کا جنون بتاتے ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک دُکھے ہوئے دل کی فریاد ہے کہ "انسانی چال کے نایاب حسن کی نہ صرف ہماری برادری نے کوئی قدر نہیں کی بلکہ اُسے مجرم قرار دیتے ہوئے وہ سزا دی ہے، جو بڑے سے بڑے گنہگار کو بھی نہیں دی جاتی۔

نفس پرستی سے مغلوب ہو کر عورتوں اور مردوں نے بے شمار رشتے قائم کئے ہیں۔ یہ رشتے ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں، سوہنی مہینوال اور شیریں فرہاد جیسے قصّوں میں لافانی کر دئے گئے ہیں۔ مذہبی کتابوں میں بھی ان کا ذکر تعریف و توصیف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ رشتے کیا تھے۔ نسوانی فطرت کی مردانہ فطرت کے لئے قدرتی تڑپ اور مصیبتیں جھیل کر اپنے محبوب کے وصال کا حصول اِن افسانوں میں فتح انسانی روح کی نہیں بلکہ انسانی فطرت کی ہے۔

لیکن "بن بیاہی ماں" کی ہیروئن فطرت نہیں، انسانی رُوح ہے۔ فطرت پر انسانی روح کی فتح اس افسانے کی بنیاد ہے۔

پربھا کو جتندر نجن کے ساتھ ہرگز عشق نہیں تھا۔ اُسے اپنا شوہر یا رفیق حیات بنانے کا بھی اسے خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس کے زیادہ

قریب ہونے کی خواہش بھی کبھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے ایک شام کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا اچانک نظر آجاتا ہے۔ ایسی حالت میں کئی دیرینہ محبتیں شکوک اور شبہات کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس کے پھانسی پا جانے میں شک کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ان کے درمیان کوئی دیرینہ میل جول نہیں، نہ ان میں کوئی دیرینہ قول و قرار ہی تھے۔ نفسانی خواہشات کا تو ایسے حالات میں ذکر ہی کیا؟

اس وقت پربھا کے دل میں حسرت و ارماں کے جذبات بیدار کرنے والا ایک خیال بار بار پیدا ہوتا ہے ——— کہ اس شخص کو بڑی بے دردی اور بے انصافی سے ہماری دنیا سے نکالا جا رہا ہے۔ اس بے گناہ ہستی کا دنیا میں کوئی وکیل نہیں۔ اس کی نوجوانی اور اس کے بے یار و مددگار ہونے پر پربھا کو رحم آتا ہے۔ اتنی وسیع و عریض دنیا میں اس کا کوئی بھی ہمدرد نہیں اور اس کی شب مایوسی میں اچانک ایک ہمدردوہ چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ کل اس کی دنیا پھر خالی اور اجڑی ہوتی ہوگی۔ کوئی شیریں یاد باقی نہ رہے گی۔ کوئی خواب دکھائی نہیں دے گا۔ آہ! کتنا ہولناک ہے پھانسی کے تختے پر چڑھنا اگر دل کے اندر کسی چھوٹی سی فتح کا بھی سہارا نہ ہو۔

یہ سہارا دینے کے لئے پربھا اپنا سارا روشن مستقبل اس کی نذر کر دیتی ہے۔ کس کی؟ جو گھڑی بھر پہلے اس کا کچھ بھی نہیں تھا۔ اور چند دن کے بعد اس دُنیا میں جس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

پربھا جس قسم کے شوہر کی خواہش کرتی، حاصل کر سکتی تھی۔ جن آنکھوں میں سمانا چاہتی، سما سکتی تھی۔ اس کا دل ابھی اس کے بس میں تھا۔ اس کے سینے میں ابھی کسی کے لئے تڑپ پیدا نہیں ہوئی تھی۔

لیکن وہ موت کو لبیک کہنے والے قیدی کی ایک خالی رات کو اپنی تمام تر زندگی کے ساتھ بھر دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

پربھا کے فیصلے میں اگر نفسانی خواہش کو ذرّہ برابر بھی دخل ہوتا۔ تو وہ اپنے آپ کو اس عظیم قربانی کے لئے ہرگز تیار نہ کر سکتی۔ اس کے اس انوکھے فیصلے کا واضح مطالبہ تھا کہ وہ اپنی جنسی زندگی کو ہمیشہ کے لئے قربان کر دے۔ اس رات کے بعد اگر وہ ایک ناپاک عورت بننا قبول نہ کرے گی تو اسے ہمیشہ کے لئے بیوہ بن کر رہنا ہوگا۔

اُس نے تمام سماجی قدروں کو جانچ پرکھ کر ایک فیصلہ کر لیا اور اپنی آرام دہ زندگی ترک کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس نے خوفناک بے انصافی اور سنگ دل دنیا میں داخل ہونا منظور کر لیا۔

یہ دُنیا اسے 'بن بیاہی' کا نام دیتی ہے لیکن اس نے کالیداس کی لافانی شکنتلا کی طرح اپنے خالق کو حاضر و ناظر جان کر چتر نجن کی قسمت کے ساتھ اپنی قسمت منسلک کر دی ——— اس لئے نہیں کہ وہ ہیر، سوہنی، لیلیٰ یا شیریں کی طرح چتر نجن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اور والدین کے منتخب کردہ خاوند سے گلو خلاصی کر کے اپنی فطرت کی تمنّا کو پورا کرنا چاہتی تھی بلکہ اس لئے کہ اس کی نازک رُوح کسی واقف ہستی کا اس دُنیا سے یوں بے یار و مددگار اٹھ جانا برداشت نہ کر سکتی تھی۔

پھر اس نے کیا بھی تو کیا؟

اپنی پُر امید ازدواجی زندگی کو بدنامی اور بیوگی پر قربان کر دیا۔

اُسے دُنیا 'بن بیاہی' کہتی ہے۔ کتنی شادیاں اس ذمہ داری کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ جس ذمہ داری کے ساتھ پربھا نے اپنا بیاہ کیا تھا؟ کتنی بیوائیں اپنی بیوگی کو اس صبر اور استقلال سے کاٹتی ہیں۔ جس کا پربھا نے مستحکم عزّم کر لیا تھا۔ اور کتنی بیوائیں صرف ایک رات کے شوہر کی یاد کو اس قدر مقدّس سمجھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل میں بسا لیتی ہیں؟

باپ کہتا ہے کہ وہ شدنی کی ساری شہادت راہ سے دُور کر کے پربھا کی شادی کسی اچّھے اور ہونہار نوجوان سے کر دے گا اور اس واقعہ

کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی لیکن پر بھا اپنے کیئے کی پوری قیمت ادا کرنے پر بضد ہے۔ اپنی کوکھ کے بچّے کو کسی کی امانت سمجھتی ہے اور اس امانت کی سچّی امین بننے کے لئے ساری دُنیا کا غیظ و غضب برداشت کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔

اس کی اس دیانت داری کا اسے کیا انعام ملتا ہے؟ والد اس کی موت کا خواہشمند ہے۔ کسی کی موت کا خواہشمند ہونا اسے مار ڈالنے یا قتل کر دینے کے مترادف ہے۔ قاتل معزز برادری کا ممبر بنا رہتا ہے۔ اور مقتول کی یاد بھی ناپاک ہو جاتی ہے۔

والدین نے اپنی عزّت بچانے کے لئے لاتعداد حمل ساقط کرائے ہیں لاتعداد والدین نے اپنی سُرخ روئی کی خاطر اپنی لڑکیوں کو قتل کیا ہے۔ وہ تو شریف تھے لیکن ان کی مقتول لڑکیاں گنہگار تھیں۔

آج ہمارے سماج میں پر بھا جیسی مستقل مزاج، پاکیزہ اور قربان ہو جانے والی کتنی لڑکیاں مل سکتی ہیں؟ کیا پر بھا کی مثال چال چلن کو مضبوط کرنے والی ہے یا بگاڑنے والی؟

یہ کہانی سماج کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اس سماج میں پر بھا جیسی لڑکی کے لئے کوئی جگہ نہیں جسے پر بھا جیسے اعلےٰ چال چلن کی قدر نہیں۔ جس کے اندر اس کی دیانتداری، اس کے احساسِ ذمہ داری، اس کی شیریں

بہی خواہ اور پُرعفو روح کو اپنایا نہیں جا سکتا۔ اس سماج کے خلاف یہ کہانی عدالتِ عامہ میں دعویٰ دائر کرتی ہے۔

پربھا کا یہ پانچواں دعوے ہے۔

پربھا کون ہے؟ اس کا جواب رسومات کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہندوستان کی آزادی طلب، نوجوان اور امنگوں بھری دیانتدار روح دے گی۔

اس وقت مجھے پربھا کی روح اپنے سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ یہ ہر راہرو کے منہ کی طرف دیکھتی ہے۔ جس کسی کا چہرہ اسے شریف دکھائی دیتا ہے۔ اس کے پاس جاتی ہے اگر وہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تو یہ جھنجھلا کر اس کا گریبان پکڑ لیتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں دونوں جہانوں کا گلہ ہے۔ اس کے ہر عضو سے حسرت ٹپک رہی ہے اور یہ غصّے سے بپھری ہوئی پوچھتی ہے:۔

بتادو! ——— بتادو! ——— کیا میں بدچلن ہوں؟ تم مجھے میرا انصاف کیوں نہیں دلاتے؟ ——— میں نے کیا کیا ہے؟

——— گوربخش سنگھ

صوبہ بہار کے مظفر پور شہر سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے پنشن یافتہ سرکاری افسروں نے شہر کے شور وغل سے دُور رہنے کے لئے ایک نئی بستی بسا رکھی تھی۔

اسی سڑک پر ایک شام کو ایک موٹر لاری ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ رفتار تو زیادہ تیز نہیں تھی۔ لیکن ایک کُتّے کو بچانے کی کوشش میں یہ حادثہ پیش آگیا۔ موٹر تو اُسی وقت بیکار ہو گئی۔ لیکن خوش قسمتی سے مسافروں کو معمولی خراشوں کے سوا کوئی قابلِ تشویش چوٹ نہیں آئی۔

یہ موٹر لاری محکمہ پولیس کی تھی۔ ایک تھانیدار انچارج تھا اور اس
کے ساتھ ایک حوالدار اور تین سپاہیوں کی حراست میں ایک قیدی تھا
جس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ لیکن
ان کی آزادانہ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب ایک خوش طبع جماعت
کے افراد ہیں۔ اس حادثے کی وجہ سے ان کے چہروں کا رنگ تو فق
ہو رہا تھا۔ لیکن چوٹ وغیرہ نہ آنے کا اطمینان ان کی زندہ دلی کو برقرار
رکھے ہوئے تھا۔

"شکر ہے کہ بچاؤ ہو گیا۔ ٹوٹی تو صرف لاری ہی ہے" سو جائے جہنم
میں۔ لیکن ایک پل کے لئے تو ہیں یہی سمجھا تھا کہ ہم پولیس والوں پر خدا
قہر نازل ہوا چاہتا ہے" تھانیدار نے اپنے کپڑوں پر سے گرد جھاڑتے
ہوئے کہا ......" ایک بے گناہ بھی تو آپ کے ساتھ تھا۔ اسی سے
بچاؤ ہو گیا"! ...... قیدی نے ہتھکڑیوں کی جھنکار میں مسکراتے ہوئے
جواب دیا۔

حوالدار نے خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے آسمان کی طرف نگاہ کی اور
کہا " بات تو کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے"۔

" لیکن ہم تب قائل ہوں گے جب وہ آپ کو پھانسی کے پھندے
سے بھی بچا لے گا"۔ ایک سپاہی نے کہا۔

"یہ کوئی اَنہونی بات نہیں - کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ لوگ پھانسی کے تختے سے اُتار کر ملک کے صدر بنائے گئے ہیں"۔ قیدی نے جواب دیا۔

تھانیدار، سپاہیوں اور قیدی کی گفتگو سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مناسب عزّت و احترام کے ساتھ ساتھ ان کی آپس میں کافی آزادی بھی ہے۔ قیدی بھی کوئی بے علم یا غیر مہذّب اخلاقی مجرم معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک ہی نظر سے بھانپا جا سکتا تھا کہ وہ ان سب میں سب سے بہتر شخصیت کا مالک ہے۔ اس کی خندہ پیشانی، بے پروا اور بےخوف صورت، عاقلانہ گفتگو اور چہرے کے تاثرات پولیس جیسی خالی از اعتماد ہستیوں کے دل میں بھی اپنے لئے ایک انوکھا بھروسہ اور یقین بٹھائے ہوئے تھے۔ ٹوٹی ہوئی لاری میں سے سامان نکالتے وقت قیدی کو تنہا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کی ہتھکڑیوں کی زنجیر تھام کر پاس کھڑے رہنے کی اُنھیں کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ جن الفاظ میں تھانیدار اور سپاہی اُسے مخاطب کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ یا تو تھانیدار کو قیدی کیساتھ پُرانی واقفیت کی وجہ سے رکھ رکھاؤ مطلوب ہے یا اس مختصر سے سفر میں قیدی کی شخصیت کا ان سب پر گہرا اثر ہو چکا ہے۔

سامان سنبھال لینے کے بعد تھانیدار نے حکم دیا کہ لاری کو وہیں

چھوڑ کر وہاں سے پانچ میل کے فاصلے پر جو چوکی ہے' اس طرف کوچ کیا جائے۔ جب یہ لوگ روانہ ہوئے' اس وقت تک سورج غروب ہو چکا تھا۔ قیدی اپنی بیڑیوں کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا تھا یہ دیکھ کر تھانیدار نے حوالدار کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو ان کی بیڑیاں کھول دیں۔ ورنہ اس رفتار سے تو چوکی تک بہت دیر سے پہنچیں گے اور کم بخت بھوک نے پہلے ہی بے حال کر رکھا ہے"۔

"اگر آپ مجھ سے دریافت فرماتے ہیں تو مجھے تو ان کی ہتھکڑیاں بھی کھول دینے میں کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ مجھے تو یہ قیدی اس قیدی کا ہم جنس معلوم ہوتا ہے۔ جس کے محافظ سپاہی کو کسی نے راستے میں قتل کر دیا تھا اور وہ خود اکیلا ہی تھانے میں جا حاضر ہوا تھا"۔ حوالدار نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ کا یہ اعتماد کہیں آپ کو دھوکا نہ دے"۔ قیدی نے جب حوالدار اس کی بیڑیوں میں چابی گھما رہا تھا' مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ جیسے آدمیوں کا خوب تجربہ ہے۔ وہ گھات (قتل) تو چاہے کر لیں لیکن لبنؤ اس گھات (اعتماد شکنی) کبھی نہیں کر سکتے"۔ یہ

کہہ کر حوالدار نے بیڑیاں کھول کر اپنی بغل میں دبالیں۔

"لیکن میرا بوجھ تو میرے سپرد کر دیں۔ آپ سب نے اپنا اپنا سامان اٹھا رکھا ہے"۔ قیدی نے اصرار کرتے ہوئے وہ آہنی سامان حوالدار سے زبردستی لے لیا۔

جب یہ لوگ اس طرح کی باتوں میں مصروف تھے تو ٹھیک اس وقت سڑک کے بائیں جانب ایک معزز دوشیزہ کھڑی بڑی حیرانی سے قیدی کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بیڑیاں بغل میں دبا کر جب وقت قیدی نے اُدھر نگاہ کی تو شام کے دھندلکے میں اس تنہا اور غیر آباد مقام پر اس کو ایک جانا پہچانا چہرہ نظر پڑا۔ اُس کی بغل سے بیڑیاں نیچے زمین پر گر پڑیں اور وہ جلدی سے دو قدم آگے بڑھ کر بولا۔

"پربھا جی! آپ یہاں کہاں؟ ہم تو شہر سے بہت دور ہیں"۔

"لیکن یہ ــــــ؟ آپ اس حالت میں کیوں ہیں؟" لڑکی نے اپنی آنکھوں پر یقین نہ کرتے ہوئے جواب دینے کی بجائے سوال کیا۔

"تھانیدار صاحب! آپ جلدی جانا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے میری بیڑیاں کھول دی ہیں۔ آپ نے بہت سی نوازشیں مجھ پر کی ہیں جن کی وجہ سے میرے دل میں آپ کے لئے بے حد قدر ہے۔ حالانکہ مجھے ان مہربانیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اب میں خود ایک نوازش

کے لئے آپ سے درخواست کرنا چاہتا ہوں"۔ قیدی نے تھانیدار سے ایسے لہجے میں درخواست کی جو سنگ دل سے سنگ دل حاکم کو بھی سوچ میں ڈال دیتا ہے۔

"کوئی بات نہیں، کہئے"۔ تھانیدار نے لڑکی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ایک پینشنر کلکٹر کی صاحبزادی ہیں۔ میرے ساتھ پڑھتی تھیں اگر اُن دنوں میں میرے دل میں کسی سے ملنے کی خواہش ہوتی تھی تو صرف ان سے۔ کیا آپ مجھے ان کے ساتھ دو چار باتیں کر لینے کی اجازت دے سکتے ہیں؟" قیدی نے دریافت کیا۔

ابھی تھانیدار کچھ کہنے ہی کو تھا کہ پربھا نے انہیں بتایا کہ وہ سیر کرتی ہوئی اپنے بنگلے سے لگ بھگ ڈیڑھ میل اس طرف آ گئی ہے۔ اور اب اُسے بھی اُسی طرف واپس لوٹنا ہے جدھر وہ جا رہے تھے۔ اس لئے انہیں وہاں رُکنے کی ضرورت نہیں وہ ان کے ساتھ ساتھ چلی چلے گی۔

حوالدار کا اشارہ پاکر سپاہی نے ہتھکڑی کی زنجیر لپیٹ کر قیدی کے ہاتھ میں دے دی اور وہ سب چار قدم پیچھے ہٹ کر چلنے لگے۔ پربھا اور قیدی آگے آگے جا رہے تھے اور قیدی کا آزاد ہاتھ پربھا کے

ہاتھ میں تھا۔ پربھا نے اسے بتایا کہ وہ سردی کی چھٹیوں کی وجہ سے اپنے والدین کے پاس آئی ہوئی تھی۔ جو اس نئی بستی میں رہ رہے تھے۔

قیدی نے بتایا کہ اس پر قتل عمد کا مقدمہ چلایا گیا تھا وہ دراصل تھا تو بے قصور۔ لیکن ظاہراً شہادتیں اس کے اتنی خلاف تھیں کہ اب اسے سیشن سپرد کر کے بڑے جیلخانے میں بھیجا جا رہا تھا۔ صوبہ بہار میں سیاسی قتلوں کی بہتات کی وجہ سے حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ اس قسم کے قتل کے معاملہ میں مقدمہ کا فیصلہ بہت جلد کیا جائے اور جرم ثابت ہونے پر مجرم کو جتنی جلدی ہو سکے پھانسی پر لٹکا دیا جائے کیونکہ پچھلے دنوں ایسے مقدمات کے التوا کے دوران کچھ اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہے تھے۔ جن سے ایسے مقدمات بگڑ جاتے تھے۔ اس کو بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لیکن آج وہ خوش تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی کی شام میں اگتے سورج کی جھلک دیکھ لی تھی۔ یعنی اس آخری وقت میں اسے اپنی رفیق پربھا کے دیدار کا موقع مل گیا تھا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بالکل بے گناہ شخص کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا جائے؟" پربھا کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

"مقتول ایک انگریز اسسٹنٹ کلکٹر تھا۔ میں شام کے وقت کمپنی باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ کہ وہ گھوڑے پر سوار میرے قریب سے گزرا۔

میں نے اُسے جاتے دیکھا تو ضرور تھا ۔ لیکن چند منٹ کے بعد اسے بھُول کر اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر میں پھولوں کا نظّارہ کر رہا تھا کہ میرے کانوں میں گولی چلنے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے کوئی شئے میرے پیروں پر آ گری ۔ چوٹ لگنے سے مجھے درد محسوس ہوا اور میں نے اٹھا کر دیکھا تو دیکھنے میں وہ ایک بوسیدہ سی گیند معلوم ہوتی تھی ۔ لیکن اس میں ایک طرف پستول کی سی نالی لگی ہوئی تھی ۔ دراصل پستول پر سفید فیتہ لپیٹ کر اس کی شکل گیند جیسی بنا لی گئی تھی ۔ صرف نالی کا سرا اور دبانے کی لبلبی ننگی تھی ۔ میں نے خوف زدہ ہو کر پستول پرے پھینک دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ مبادا کسی نے مجھے پستول ہاتھ میں لئے دیکھ لیا ہو ۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خوف سے میرے چہرے کی حالت اسی قاتل کی سی ہو رہی ہے ۔ جو قتل کرنے کے بعد بچاؤ کے لئے اِدھر اُدھر جھانکتا ہے ۔ مجھے وہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا اور میں تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل دیا ۔ تبھی ایک سپاہی نے مجھے گردن سے آ پکڑا اور کھینچتا ہوا مجھے پستول کے پاس لیجا کر کھڑا کر دیا میں نے بہت کچھ کہا ۔ لیکن میری بات پر کسی نے یقین نہیں کیا اور پولیس نے کئی چشم دید گواہ بھی پیدا کر لئے ۔" اس وقت قیدی کی آنکھوں میں مایوسی کا عکس تھا ۔

"لیکن آپ کے پتا جی اتنے بڑے سرکاری افسر ہیں وہ ضرور آپ کو رہائی دلا سکتے ہیں۔ یہ کیسے، ——— ہاں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ جیسی بے گناہ ہستی کو بچانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔" پربھا کی آواز میں حسرت وارمان بھرا تھا۔

"آپ تو جانتی ہی ہیں، میرے والد بزرگوار کس سرکاری شہرت کے مالک ہیں۔ جب کبھی ان کو میرے متعلق کالج سے اس قسم کی شکایت موصول ہوتی تھی کہ میں سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتا ہوں یا سٹرائیکوں میں شامل ہوتا ہوں تو وہ مجھے عاق کر دینے کی دھمکی دیا کرتے تھے اور اب یہ خبر سنتے ہی وہ حکومت کے عتاب سے اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ میری بات سُنے اور اصل حالات جانے بغیر ہی انھوں نے اعلان کر دیا ہے کہ میرے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں اور وہ میری کسی قسم کی مدد نہیں کرینگے۔" قیدی نے آہ بھر کر کہا۔

پربھا بولی ——— "اوہ! یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہ سرکاری عہدیدار، یہ قومیت سے بیگانہ جماعت ہماری نئی بستی میں بھی ہے۔ ہر دوسرے بنگلے میں ایک رائے بہادر یا خاں بہادر رہتا ہے۔ حکومت کے ماتحت انھوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ کمشنوں کے صدر رہے ہیں۔ عالیشان عمارتیں اور

مشکل ترین پل تعمیر کرانے کے بعد پنشنیں حاصل کی ہیں لیکن اپنے لئے ایک عمدہ سڑک بھی نہیں بنوا سکے۔ کلب میں بھٹیارنوں کی طرح ایک دوسرے سے اُلجھتے اور طعنے دیتے ہیں۔ آوازے کستے ہیں اور ٹُکّے دکھاتے ہیں۔ ان سرکاری افسروں جیسے بے دل، بے مروّت، مغرور اور غیرت سے کورے آدمی شاید ہی کہیں ملیں گے"۔

"اور بے اصُول بھی"۔ قیدی نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایک طرف تو میرے والد صاحب میرے ساتھ قطع تعلّق کا اعلان شائع کراتے ہیں اور دوسری طرف میرے پاس ایک وکیل کو بھیجتے ہیں جو خُفیہ طور پر اُن سے فیس لے کر میرے مقدّمے کی پیروی کرتا ہے لیکن میں نے ان کی مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میرے بزرگوار والد کو یہ معلوم نہیں کہ میں انھیں کی شہرت کا شکار ہو رہا ہوں۔ قاتل کوئی جوشیلا باغی ہے وہ میرے دل سے تو واقف نہیں وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ میں فلاں رائے بہادر کا بیٹا ہوں جو حکومت کی پیچیدہ سے پیچیدہ اُلجھن سُلجھانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے لیکن اپنے ہموطنوں کے ساتھ بات کرنے میں بھی اپنی ہتک سمجھتا ہے اور اسی لئے باغی نے ایسے شخص کے بیٹے کے پاؤں میں پستول پھینک کر ایک پنتھ دو کاج والی بات کرنا چاہی ہے"۔

اتنے میں سڑک کا وہ موڑ آ گیا جہاں سے پربھا کو اپنے بنگلے کی طرف مڑنا تھا۔ اس لئے وہ سب وہاں رُک گئے۔ ادھر پربھا کے دل میں ایک عجیب سا طوفان مچا ہوا تھا وہ چترنجن کو اپنے کالج کے تمام طلباء سے شریف اور اچھا خیال کرتی تھی لیکن چترنجن اس کے زیادہ قریب کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے وہ اس کے اندرونی حُسن کو نہیں دیکھ سکی تھی۔ وہ اس سے مل کر خوش تو ضرور رہا کرتی تھی ——— لیکن اس کی جُدائی نے کبھی پربھا کو بے چین نہیں کیا تھا مگر آج چترنجن کو سپاہیوں کے پاس چھوڑ کر اپنے بنگلے کی طرف جانا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ وہ چترنجن کے ساتھ ساتھ تو کہیں بھی جا سکتی تھی لیکن کسی دوسری طرف کے لئے اس کے قدم نہیں اُٹھتے تھے۔

اگرچہ چترنجن نے بھی کبھی پربھا کو اپنی رفیقۂ حیات کے روپ میں اپنانے کا تصوّر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے چہرے سے اُس کی رُوح کی ساری خاموش مُنتیں آشکارا تھیں۔ اُسے خود علم نہیں تھا۔ کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ پربھا سے کسی بات کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے جسم کے روئیں روئیں سے ایک خواہش پھوٹی ہوئی تھی۔ وہ مرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ وہ اپنی تاریک مایوسی میں کسی بشر سے کوئی توقع نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اچانک ایک طرف سے تاریکی کے بادل

چھٹ گئے - اور اُسے اُجالا نظر آ گیا - وہ پرانی تاریکی اب اسے کھانے کو دوڑتی معلوم دینے لگی - "پربھا چلی جائے گی" - قوی سے قوی دل بھی آسانی سے اس احساس کا کچوکا برداشت نہ کر سکتا تھا۔

چتر بجن نے اپنے آزاد ہاتھ سے پربھا کو اپنے پہلو میں کھینچ کر گلے سے لگا لیا اور اس کو الوداع کہی -

"نہیں چتر بجن! اب میں واپس نہیں جا سکتی"۔ پربھا کی آنکھیں نمناک تھیں۔

"آخر جانا ہی پڑے گا"۔ یہ کہتے ہوئے چتر بجن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

"دس منٹ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا - لیکن اب واپس جانا ناممکن ہو گیا ہے - میں آپ کے ساتھ جاؤں گی - کل جب آپ یہاں سے چلے جائیں گے تو میں بھی لوٹ آؤں گی"۔ پربھا نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں چوکی پر آپ کی رہائش کا انتظام کر سکتا ہوں اور اگر آپ چاہیں تو آپ کے بنگلے پر اطلاع بھی بھجوا سکتا ہوں"۔ تھانیدار نے ہمدردی سے جواب دیا۔

"آپ کی نوازش - لیکن اطلاع بھجوانے کی ضرورت نہیں" اور پربھا

آگے کو بڑھی ۔کیونکہ اس کی وجہ سے سب کو دیر ہو رہی تھی ۔

" نہیں پربھا! یہ کیسے ہو سکتا ہے " چترنجن نے موقعہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا ۔

" اب تو یہ اسی طرح ہو گا ۔ مجھے نہیں معلوم کیوں اور کیسے ؟ لیکن اُس وقت میں دُنیا کے تمام رشتوں اور ناطوں سے بے تعلق ہو گئی ہوں میں چاہتی ہوں کہ آپ کی ہتھکڑی میں میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ کے ساتھ بندھ جائے ۔ میں آپ کے ساتھ ساتھ چلوں ۔ حوالات میں آپ کے ساتھ رہوں ۔ آپ کے ساتھ پھانسی کے تختہ پر کھڑی ہو جاؤں اور ہم دونوں کی گردنیں ایک ہی جھٹکے سے ایک ہی وقت ٹوٹ جائیں "۔ پربھا اس وقت اس بندھی حکڑی دُنیا کی مخلوق معلوم نہیں ہوتی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں کسی عرشی طائر کی پرواز کا عکس تھا ۔

چترنجن کی بے بسی اور اس کی بے یار و مددگار حالت اگر مدد کے لئے نہیں تو رفاقت کے لئے ضرور پکار رہی تھی ۔ لیکن وہ پربھا کی اس حد تک کی قربانی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو سکا ۔ کالج میں وہ اس کی ایک معمولی ساتھی تھی ۔ وہ اُس کے دل کا مالک نہیں تھا اور نہ ہی اُس نے اپنا دل پربھا کی نذر کیا تھا ۔ لیکن اس آدھ گھنٹے میں نہ جانے کونسا جادو تھا جس نے پربھا جیسی صاف باطن لڑکی کا دل عُریاں کر دیا ۔ دو سال

کے عرصے میں جو ایک دوسرے کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی جُرأت نہ کر سکے تھے، اس آدھ گھنٹے کے اندر کیسے ایک ساتھ سُولی پر چڑھنے کے لئے تیار ہو گئے ؟

وصال کے ختم ہونے والے لمحوں میں ایک عجیب قسم کی سُرعت ہوتی ہے۔ جو قول و قرار گیارہ گھنٹوں میں نہیں ہوتے بعض اوقات وہ گھڑیال کی بارھویں چوٹ پر ہو جاتے ہیں۔ سفر کی آخری منزل پر یا جہاز کے آخری بندرگاہ پر پہنچنے والے دن کئی خام واقفیتیں پختہ دوستیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح زندگی کے آخری لمحوں میں تنہا خالص دل کئی مرتبہ محبت کے لئے اس طرح تڑپ اُٹھتے ہیں کہ جو دامن بھی کھلا نظر آ جائے۔ اُسی میں گر کر دم توڑ دیتے ہیں۔

انتہائی کم مُدّت کے بعد اس جوان زندگی کے لئے مقررہ پھانسی کا تختہ دیکھتے ہوئے بھی، ایک بے مروّت رائے بہادر کی بیٹی پربھا نے ——— اپنی تنہائی اور اس بے رُوح ماحول سے مایُوس ہو کر دُنیوی پابندیوں سے آزاد پرواز کے لئے تڑپنے والی اُس دلیر اور بے خوف پربھا نے ایک پل کے اندر، اپنے دل میں کیسری پٹے کے بجائے پھانسی کا پھندا اٹھا کر اس بے یار و مددگار، بے قصور اور بے داغ چتر بخن کے ساتھ بیاہ رچا لینے کا فیصلہ کر لیا۔

پارٹی پولیس چوکی پر جا پہنچی ۔ زندہ دل تھانیدار کو بھی پربھا اور چیتر بجن کے اس ماتمی عشق سے ہمدردانہ سرور حاصل ہو رہا تھا۔ چیتر بجن کی طرف سے اسے کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا ۔ اس کا قیدی کسی صورت میں بھی لبنتواس گھات نہیں کر سکتا تھا ۔ وہ اس مہلک محبّت کے پہلے اور آخری ملاپ کو ہمدردی کے آنسوؤں سے چھلچھلاتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ جس طرح مرنے والے کی معمولی یا غیر معمولی خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اسی طرح تھانیدار نے چیتر بجن کی ان کہی خواہشات کو پُورا کر دیا۔

ہتھکڑی اتار دی گئی ۔ چوکی میں جو بہترین کمرہ تھا وہ قیدی کے لئے مخصوص کر دیا گیا ۔ کھانا بڑے شوق سے تیار کرایا گیا اور عزّت کے ساتھ ان کے پاس بھیجا گیا۔ سب حیران تھے کہ زندگی موت کے ساتھ بیاہی جا رہی ہے ۔ وہاں کے پُورے ماحول میں ایک انوکھے قسم کا رحم تھا ۔ جو ہر طرف اُمڈا پڑتا تھا ۔ اور جو زندگی میں کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتا ہے ۔ جو کوئی سنتا تھا قربان ہو ہو جاتا تھا اور اُن کے لئے دعائیں مانگتا تھا۔

دن کی صبح صادق، پربھا کی شام زندگی، سورج کی شعاعیں، چترنجن کی اماوس، ملاپ ختم ہوگیا۔ خواب ٹوٹ گیا لیکن کئی خوابوں کی یادان خوابوں سے بھی زیادہ شیریں ہوتی ہے۔ اور جُدائی کی گھڑیوں کو بہت دیر تک تھامے رکھتی ہے۔ وہ میٹھی یاد فرقت کا دل بہلادا اور مُصیبت کا سہارا بن جاتی ہے۔

قیدی اور سپاہی تیار ہوکر لاری کے قریب کھڑے تھے۔ تانگے کا انتظار تھا۔ وہ بھی پہنچ گیا۔ تھانیدار نے پہلے چترنجن اور پھر پربھا

کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ جدائی نہایت دردناک ہوگی۔ لیکن دونوں خاموش تھے۔ صبر کی زندہ تصویریں۔ دُنیا جانے نہ جانے۔ لیکن جس نے محبّت کی ہو، جس نے شبِ وصل میں بیدار رہ کر دیدارِ محبُوب سے اپنی آنکھوں کو پُر کر لیا ہو اور عرصۂ دراز کی حسرتیں اور ارمان آنسوؤں کے ذریعہ باہر نکال لی ہوں۔ اس کی جدائی آنسوؤں اور لفظوں کی محتاج نہیں رہتی۔ مُدّت مدید تک آنکھوں میں ایک میٹھی سی جھلک بسی رہتی ہے جو رونے نہیں دیتی۔

سپاہی لاری میں سوار ہو گئے۔ چترنجن نے پربھا کی طرف دیکھا، پربھا نے چترنجن کی طرف، الفاظ شاید سب کہے جا چکے تھے۔ کیونکہ دونوں کے مُنھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ حوالدار کے ہاتھ میں جب زنجیر کی جھنکار ہوئی تو چترنجن نے پربھا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"ہتھکڑی لگنے سے پہلے ان کو ایک بار پھر دبا لوں، پیار کر لوں، آخری بار پربھا جی"۔

"میں مظفر پور آؤں گی، پھر ملوں گی۔ پھر ہاتھ میں ہاتھ دوں گی"۔
پربھا کے چہرے پر کسی پُختہ اراد ے کی جھلک تھی۔

لاری چل پڑی، پربھا کھڑی دیکھتی رہی۔ لاری میں سے ہتھکڑی

والا ہاتھ زور سے ہوا میں لہرایا - پھر چہرہ غائب ہو گیا اور پربھا کا تانگہ بھی روانہ ہو گیا۔

اسے ہر جگہ ڈھونڈا جا چکا تھا - والدین بے حد فکر مند تھے - اتنے میں پربھا آ پہنچی - تانگے والے کو اس نے کچھ پرے ہی رخصت کر دیا تھا اگرچہ وہ طبعاً ہی بے خوف تھی - لیکن آج تو اس کے چہرے پر خوف کا نام و نشان بھی نہیں تھا - وہ مایوس بھی نہیں تھی - کیونکہ اس نے جو قدم اُٹھایا تھا - اس نے تمام پہلوؤں سے سوچ بچار کر اُٹھایا تھا - اُس نے دیدہ دانستہ لقمۂ اجل ہونے والے محبوب کا انتخاب کیا تھا -

والدین نے نوجوان لڑکی کے رات بھر گھر سے غائب رہنے کی وجہ دریافت کی تو پربھا نے بلا جھجک جواب دیا -

" میں سیر کرتی ہوئی جا رہی تھی کہ سڑک پر ایک لاری درخت کے ساتھ ٹکرا گئی - ان مسافروں میں میرا ایک ہم جماعت لڑکا تھا جسے میں ہمیشہ سے اچھا سمجھتی رہی ہوں - اسے چوٹیں تو زیادہ نہیں آئی تھیں - لیکن دل سے وہ بہت دُکھی تھا - ان لوگوں کو ساتھ والے گاؤں جانا تھا میں نے سوچا - میرا ساتھ اس کے لئے خوشی کا باعث ہو گا - اس لئے میں اس کے ساتھ چلی گئی "

" کیا وہاں اس کا گھر ہے اور اس کے ماں باپ بھی وہیں رہتے

ہیں؟" ماں نے اپنی تسلّی کے لئے پوچھا۔

" اس سوال کا جواب میں ایک ہفتے کے بعد دوں گی۔ پرسوں میں پتاجی کو موٹر گاڑی کے لئے تکلیف دونگی۔ مجھے مظفر پور جانا ہے۔ وہاں سے واپس آکر آپ کو اس بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔ میری اچھی ممی! آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔" اور پربھا نے اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے تمام شبہے دُور کر دیئے۔

پربھا رات بھر بڑے جیل خانے اور عدالت کے کمرے کے خواب دیکھتی رہی۔ چترنجن کو اپنے بچاؤ کی قطعی اُمید نہیں تھی۔ لیکن پربھا کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ایک بے قصور شخص کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا جائیگا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ مظفر پور کے کسی مشہور اور قابل وکیل کا مشورہ لے گی۔ اس کی فیس کا وہ انتظام کر سکتی تھی۔ کیونکہ والد کی طرف سے اُسے فراخدلی کے ساتھ جیب خرچ ملتا تھا۔ اور کفائت شعار ہونے کی وجہ سے اُس نے ایک چھوٹی سی رقم اپنے اخراجات سے بچا کر جمع کر رکھی تھی۔ جیسے تیسے سوتے جاگتے اور بستر پر کروٹیں لیتے پربھا نے وہ رات

کاٹی۔ کسی کے دل و جان میں سما جانے کی جو کیفیت بیان کی جاتی ہے۔
ٹھیک وہی حالت اس کی ہو رہی تھی۔ صبح جب بستر پر سے اٹھی تو اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ اسے لوگوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ قریب سے گذرتے ہوئے لوگ اسے دکھائی نہیں دیتے تھے۔
اس کے اعضا گذشتہ شب کے ملاپ سے ابھی تک حساس تھے۔
اور یہ احساس بعض اوقات اس قدر حقیقی شکل اختیار کر لیتا کہ اُس کی آنکھیں سرورِ مسرّت سے از خود بند ہو جاتیں اور پھر جب وہ آنکھیں کھولتی تو حیران ہو کر چاروں طرف دیکھتی۔ یہ جاننے کے لئے کہ وہ اپنے باپ کے بنگلے پر ہے یا اس قیدی کے ساتھ پولیس چوکی میں۔
ماں کو بھی پربھا کا دن بھر کا وطیرہ کچھ عجیب اور غیر معمولی لگا کیونکہ اُس دن نہ تو اُس نے کسی کتاب کا مطالعہ کیا اور نہ ہی بن بلائے کسی سے بات کی لیکن ماں کو اپنی بیٹی کی سمجھ بوجھ پر کسی قسم کا شبہ نہیں تھا۔ پربھا کا مذاق نہایت اعلیٰ اور اس کی خود ضبطی اُس کی عمر کے لحاظ سے کہیں زیادہ مانی جاتی تھی۔

پربھا دن بھر اگلی صبح کو مظفر پور پہنچ کر چترنجن کی مدد کرنے کے خیال میں ڈوبی رہی۔ شام اتر آئی لیکن وہ برابر بنگلے کے باغیچے میں بیٹھی رہی۔
اندھیرا ہو جانے پر پربھا کی ماں اس کی تلاش میں باہر نکلی۔ اُس نے

دیکھا کہ پربھا مایوس صورت بنائے نرگس کے شگفتہ پھولوں کی کیاری کے پاس ایک بنچ پر بیٹھی ہے۔ پھولوں کی آنکھوں اور پربھا کی آنکھوں میں صرف رنگت ہی کا فرق تھا۔ دونوں نیچے جھکی ہوئیں نازک اور پُرنم تھیں۔

ماں بھی اس کے ساتھ اُسی بنچ پر جا بیٹھی۔ پربھا اٹھی اور کیاری میں سے وہ پھول توڑ لائی اور ان پھولوں کی زرد پنکھڑیوں کو کسی شیریں غم میں رونے والی آنکھوں کے ساتھ تشبیہہ دینے لگی۔ تبھی اس کے والد کی موٹر بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی اور ماں بیٹی کو باغیچے میں بیٹھے دیکھ کر وہ بھی وہاں آ گئے۔ ماں نے نرگس کا ایک پھول ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

راؤ بہادر ابھی اُس پھول کو اپنے کوٹ کے کالر میں لگا ہی رہے تھے کہ ایک دم ان کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ بوکھلا کر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی اہلیہ بھی بنچ سے نیچے گر پڑی تھی۔ اور پربھا اپنی ماں کو تھامنے کی کوشش میں خود زمین پر جا گری تھی۔ انھوں نے بنگلے کی طرف دیکھا تو وہ بھی جھول رہا تھا۔ چاروں طرف سے 'رام رام' اور 'یا خُدا' کی آوازیں آ رہی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے بنگلے کی کئی دیواریں اور چھتیں دھم سے نیچے آ رہیں پڑوس والا بنگلہ بھی کھنڈر میں بدل ہو گیا۔ چاروں طرف اودھم مچ اٹھا۔ سب نیچے دب گئے۔ 'آہ! میرا بیٹا!' 'اُف ہمارے بابوجی' 'ارے کوئی مجھے نکالو'

کی دردناک آوازوں سے فضا گونجنے لگی۔

تھوڑی دیر کے لئے زمین سنبھلی اور جھٹکے بند ہوئے تو راؤ صاحب اپنی بیٹی اور بیوی کے قریب گئے۔ ماں کو جب ہوش آیا تو سمجھ گئی یہ بھونچال تھا۔ خاوند کو گلے لگا کر پرماتما کا شکر ادا کیا اور کہنے لگی کہ پربھا آج دیر تک باہر بیٹھی رہی تھی یہ اسی کا طفیل ہے کہ ہم بنگلے کے اندر نہیں تھے ورنہ سب دب گئے ہوتے۔

جھٹکے بند ہوئے تو چاروں طرف سے تباہی، بربادی اور آہ و بکا کی اور بھی دلدوز صدائیں آنے لگیں۔ سردی کا زمانہ تھا اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن وہاں تو سر چھپانے کو بھی کوئی ٹھکانا نہ بچا تھا اور اگر کہیں کوئی برآمدہ یا کمرہ گرنے سے بچ بھی گیا تھا تو وہ بھی موت کا پنجر معلوم ہوتا تھا۔

پربھا کو اپنے گھریلو ملازموں کا خیال آیا تو وہ باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ وہاں ان کا مہتر اور اس کی بیوی ایک جگہ سے جلدی جلدی اینٹیں ہٹا رہے تھے۔

"پنڈت جی دب گئے ہیں"۔ مہتر نے کہا۔

پربھا بھی اینٹیں ہٹانے لگی۔ مہترانی اپنا دامن سمیٹتی تھی تاکہ پربھا سے چھو نہ جائے لیکن پربھا کو کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ تو اپنے بوڑھے

باورچی کو کھود نکالنے کے لئے مشین کی طرح مصروف کار تھی۔ لکڑیاں ہٹانے، اینٹیں اکھاڑنے اور ملبہ پھینکنے سے اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے۔ نازک انگلیوں سے خون رسنے لگا۔ ساڑی پھٹ گئی، بال بکھر گئے، چہرہ گرد آلود ہو گیا۔ لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا اور نہ معلوم کرنے کی اسے فرصت تھی۔

خوش قسمتی سے باورچی کے چوٹ نہیں آئی تھی۔ ایک شہتیر کی اوٹ میں آجانے سے وہ بال بال بچ گیا تھا۔ بوڑھے مصر نے گود میں کھلائی ہوئی پربھا کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے زخمی ہاتھوں کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ پھر راؤ صاحب اور رانی صاحبہ کی خیریت پوچھی۔

پربھا نے مہترانی کی بہت تعریف کی۔ وہ پربھا سے دور دور ہٹتی تھی لیکن پربھا نے دوڑ کر اسے گلے سے لگا لیا اور پوچھا کہ اس کے بچے کہاں ہیں؟

"ہم سب دب گئے تھے لیکن ہماری جھونپڑی کا گھاس پھوس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس لئے سب صحیح سلامت نکل آئے ہیں" مہتر نے جواب دیا۔

راؤ صاحب کی موٹر گیرج میں نہ ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی۔ انھوں نے پربھا اور اس کی ماں کو موٹر میں بٹھا کر چاہا کہ باہر جا کر تمام حالات کا جائزہ لیں اور اگر ممکن ہو تو سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا تلاش کریں۔ لیکن

دو فرلانگ جانے کے بعد ہی انھیں لوٹنا پڑا۔ آگے راستہ بند تھا۔ دونوں طرف پُل ٹوٹے ہوئے تھے۔ سڑک پہچانی نہیں جاتی تھی۔

راؤ صاحب کے کنبے نے رات موٹر ہی میں گذاری۔ ساری رات چھوٹے بڑے جھٹکے آتے رہے۔ لیکن ابھی تک انہیں اس حادثے کی خوفناک تفصیل کا علم نہیں تھا۔ صبح ہوئی تو طرح طرح کی خبریں ملنے لگیں کئی جگہ سے زمین پھٹ گئی تھی۔ پانی نکل آیا تھا۔ جگہ جگہ پانی بہہ رہا تھا مظفر پور میں ایک بھی مکان گرنے سے نہیں بچا تھا۔ عدالتیں۔ جیل۔ ہسپتال اور دفاتر سب گر کر ملبے کا ڈھیر ہو گئے تھے۔

پربھا کی رُوح چیتر بخن کے لئے تڑپ رہی تھی کس سے پوچھے؟ لوگ کہتے تھے کہ بڑی جیل کی کوٹھڑیوں میں سب لوگ دب گئے تھے۔ جو قیدی کسی طرح بچ گئے تھے وہ بھاگ نکلے تھے۔ اب وہاں ایک بھی قیدی نہیں۔

دو دن کے بعد راستے کچھ صاف ہوئے۔ پربھا مظفر پور پہنچی۔ سارا مظفر پور بڑا ہی ہولناک منظر پیش کر رہا تھا لیکن اس کا دل تو جیل کے کھنڈرات میں تھا۔ کہاں سے کھودے؟ کہاں دیکھے؟ کس سے پوچھے وہاں تو کوئی بولتا ہی نہیں تھا۔ کچھ بتاتا ہی نہیں تھا۔

ملبے سے لاشیں نکالی جا رہی تھیں۔ پربھا جا جا کر دیکھتی! دُرپریتم کھ

نہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتی ۔ آنکھوں میں امید کی جھلک بھر جاتی۔

پھر فہرستیں تیار ہوئیں ۔ مردہ لاشوں کی فہرست میں چتر نجن کا بھی نام تھا ۔ پربھا نے جیل کے کھنڈرات میں نکالی گئی ہر لاش کو دیکھا تھا ——— شاید چہرہ بگڑ گیا ہو ۔ نقش بدل گئے ہوں جس کی وجہ سے وہ اپنے چتر نجن کو نہیں پہچان سکی ۔ لیکن جیل کے افسروں نے وہ فہرستیں قیدیوں کے گلے میں آویزاں نمبروں کے انحصار پر مرتّب کی تھیں۔

پربھا تو بچ گئی ۔ لیکن پربھا کی زندگی کی تمام اُمیدیں اس زلزلے کے کھنڈرات کے نیچے دفن ہوگئیں۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں، کالج کھُل گئے۔ لیکن پربھا نے کالج میں واپس
جانے کا خیال ترک کر دیا۔ اس پر اس کے والدین بہت مایُوس ہوئے۔
پربھا سمجھتی تھی کہ اگرچہ اس کی زندگی کے کلاک کی سوئیاں گھوم رہی ہیں۔
لیکن اندر سے ٹک ٹک کی آواز بند ہو چکی ہے یکسوئی کے بغیر امتحانات
میں کامیابی ناممکن ہے اور اس کی یکسوئی بہت گہری دفن ہو چکی ہے۔
اسی طرح دنوں کے بعد ہفتے اور ہفتوں کے بعد مہینے گذرتے گئے۔
کھنڈرات اور مٹی کے ڈھیروں کو ہٹا کر نئے سرے سے عمارتیں تعمیر ہونا

شروع ہوگئیں۔ نئے کاروبار اور نئی مصروفیتیں پیدا ہوگئیں، کئی زخم مندمل ہوگئے۔ کئی نئی شادیاں ہوگئیں اور کئی بربادیاں پھر سے آبادیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ کئی دلوں میں لگی آگ بجھ گئی۔

لیکن آہ! پربھا کے سینے میں کبھی نہ بجھنے والی چنگاری سُلگ رہی تھی۔ ماں باپ کو اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ چیتر بخن کی موت کا غم کرتی ہے۔ لیکن اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ اُس غم کو اتنا عزیز اور سینے کے اندر سنبھال کر رکھے گی۔ ایک اچّھا دوست یا یوں کہیئے کہ ایک پیارا دوست داغِ مفارقت دے گیا۔ اُس کی موت کا غم ہوا، کتنے دن، ہفتے دو ہفتے، مہینہ دو مہینہ اور بس، کوئی دوستوں کے ساتھ ستی تھوڑی ہو جاتا ہے۔

لیکن پربھا روز بروز زیادہ غمگین ہوتی جارہی تھی۔ ڈاکٹروں اور رشتہ داروں سے مشورہ کیا گیا۔ سب کی یہی رائے تھی کہ پربھا کی شادی کر دینی چاہیئے لیکن پربھا کوئی بے زبان لڑکی نہ تھی کہ کسی کو اس کی سگائی بغیر اس کی اجازت کے کرنے کی جُرأت ہوتی۔ باپ نے ایک دو نوجوانوں کے متعلق سوچا اور بیوی سے مشورہ لیا۔ آخر ماں نے ایک شام کو جب پربھا باغیچے میں گھاس پر بیٹھی پھولوں کی شبنمی آنکھوں میں جھانک رہی تھی، یوں ذکر چھیڑا:-

"پربھا! تم نے پڑھائی ترک کر دی ہے ۔ تم کہیں باہر گھومنے پھرنے بھی نہیں جاتیں ۔ اسی لئے تمھارا دل اُداس رہتا ہے ۔"

"میرا دل ان پھولوں کے ساتھ بہل جاتا ہے ممی! میں اور کچھ نہیں چاہتی ۔"

"لیکن تمھارے پتا تو بہت کچھ چاہتے ہیں .... اور میں بھی چاہتی ہوں ۔" ماں نے کہا ۔

"اگر میں آپ کی خواہش پوری کرنے کے لئے کچھ کر سکوں تو ضرور کرونگی" یہ کہتے ہوئے پربھا نے بے دلی کے ساتھ آہ کھینچی ۔

"تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو ۔ ہماری ساری خوشیوں کا دار و مدار تم پر ہی تو ہے ۔ ابھی کوئی جلدی تو نہیں تھی لیکن اب جب کہ تم نے پڑھائی چھوڑ دی ہے ۔ اور اس طرح اُداس رہتی ہو، تمھارے پتا جی چاہتے ہیں کہ تمھاری شادی کر دی جائے ۔"

پربھا نے آنکھیں نیچی کر لیں ۔

"تم کوئی ہماری طرح پرانے زمانے کی لڑکی تھوڑی ہو ——— جو اپنی شادی کے بارے میں بات چیت نہ کرو ۔ تمھارے پتا نے ایک دو لڑکے پسند کئے ہیں لیکن وہ تمھاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہتے ۔" ماں نے پربھا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔

پربھا نے نظریں اُٹھائیں ۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں ۔
"لیکن پربھا یہ کیوں ؟" ماں نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے پُوچھا۔
"کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا"۔ پربھا نے جواب دیا ۔
"وہ کیوں ؟ آخر لڑکیوں کو شادی کرنا ہی پڑتی ہے ۔ اگر ہمارا چُناؤ ٹھیک نہیں تو جہاں تم چاہو گی ...."
"چناؤ کی بات نہیں"۔
"تو پھر اور کیا بات ہے ؟" ماں نے سوال کیا ۔
"میں بیوہ ہوں"۔ پربھا نے انگلی سے آنکھوں سے آنسو جھاڑتے ہوئے جواب دیا ۔
ماں یہ سُن کر ایکدم ششدر رہ گئی ۔ لیکن ناقابلِ بیان بات کہہ کر پربھا مطمئن ہو گئی ۔ اس کی آنکھوں میں اور آنسُو نہ آئے ۔
"کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے کیا سُنا ہے"۔ ماں نے پہلا صدمہ برداشت کرتے ہوئے پُوچھا ۔
"میں نے کہا تھا کہ میری شادی نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ میں بیوہ ہوں"۔ پربھا نے اسی طرح بلا جھجک جواب دیا ۔
"وہ کیسے ؟ شادی تمھاری نہیں ہوئی ، ڈولی میں تم نہیں چڑھیں اور تم کہہ رہی ہو .... ؟"

"چترنجن سے میری شادی ہو گئی تھی - وہ مر چکا ہے اور میں بیوہ ہوں"

"کس نے کی تھی تیری شادی؟"

"میں نے خود کی تھی"

"وہ کب؟"

"جس رات میں گھر سے باہر رہی تھی"

"پگلی! کبھی شادیاں بھی اس طرح ہوتی ہیں؟ چھوڑو پاگلوں کی سی باتیں - تم نے تو میرے ہوش ہی اُڑا دئیے تھے"

ماں نے پربھا کی باتوں کو ایک زخم خوردہ دل کا افسوسناک مذاق سمجھا۔

"نہیں ماتا جی! میں آپ کو کسی بھرم میں نہیں رکھنا چاہتی میں سمجھتی ہوں کہ پروہتوں کے بغیر بھی شادی ہو سکتی ہے کیونکہ شادی دو دلوں کا معاہدہ ہے - دوسری رسمیں نظر انداز کی جا سکتی ہیں لیکن شادی کی اصلی رسم دو دلوں کا ملاپ ہے - کوئی پنڈت پروہت میری شادی کے رشتے کو اس سے زیادہ مضبوط نہیں کر سکتا تھا"

"پھر وہی پاگلوں کی سی بات،" ماں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ تو میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم نے اپنی منگنی چترنجن سے کر لی ہو لیکن میں یہ کیسے سمجھوں کہ شادی کئے بغیر بھی کوئی عورت بیوہ ہو سکتی ہے - منگنیاں ہوتی

ہیں منگیتر مر جاتے ہیں ۔لڑکیاں دوسری جگہ بیاہی جاتی ہیں ۔ پربھا پیاری! چھوڑو ایسی باتیں اور اپنے ماں باپ کو خوشی منا لینے دو۔"

"لیکن ماتاجی! میں سچ مچ بیوہ ہوں ۔میری شادی کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہو سکتی میں نے اس دن اپنے بھگوان کو حاضر ناظر جان کر قول دیا تھا ۔کوئی برات اس پروردگار سے بہتر گواہ نہیں ہو سکتی ۔کسی بیدی کے چکّر ایک دوسرے پر نچھاور ہونے والے دلوں سے زیادہ متبرک نہیں ہو سکتے۔ ماتاجی! میں بیاہی گئی ۔میں ودھوا ہوگئی ۔میں اپنے پتی کے بچّے کی ماں ہوں"۔ پربھا نے بغیر کسی پشیمانی یا جھجک کے جواب دیا۔

پربھا کی ماں اگرچہ کافی عقل مند اور فراخ دل عورت تھی ۔لیکن وہ پربھا کی اس انوکھی شادی کو ہرگز نہ سمجھ سکتی تھی ۔کسی کے بچے کی بن بیاہی ماں ہونا سُن کر اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی جیسے گذشتہ زلزلے کا ہچکولا پھر آ گیا ہو۔

"پربھا! آخر یہ سب ہے کیا؟ میں صاف صاف سُننا چاہتی ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آفت ٹوٹ پڑی ہے ۔مجھے جلدی بتا دو میرا دل بیٹھا جا رہا ہے"۔ ماں نے پربھا کے جسم کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا۔

اندھیرا چھا رہا تھا اور سردی بھی اُتر آئی تھی۔ اس کے علاوہ معاملہ نازک ترین مرحلے پر پہنچ گیا تھا اس لئے پربھا نے خواہش ظاہر کی کہ بنگلے کے اندر جا کر بات کی جائے۔

وہ اپنی ماں کو سہارا دے کر اندر لائی۔ جس کے دل میں بغیر پوری طرح سمجھے ہی کوئی ناشدنی کھٹک رہی تھی۔ اندر آتے ہی وہ صوفے پر گر گئی۔ پربھا کا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا لیکن اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہیں تھے۔ اس نے ماں کے ہاتھ پاؤں ملے۔

"اب بتاؤ پربھا! تم پر کون سی انہونی ہو کر گذری ہے؟"

"کوئی انہونی نہیں گذری"۔ پربھا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ ذرا صبر سے میری بات سُن لیں۔ جو کچھ میں نے کیا ہے میں اس کی پوری قیمت دینے کے لئے تیار ہوں۔ ایک بار ذرا صبر سے میری بات سُن لیجئے۔"

"سناؤ!" ماں نے پھر پربھا کے جسم کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب کی قسمت راکھ ہو گئی ہے۔"

"میرے خیال میں تو کچھ بھی برا نہیں ہوا۔ کیونکہ پرماتما کی طرف سے تو کوئی آفت نہیں آئی۔ سر پر کوئی پہاڑ نہیں گرا۔ یہ ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ کروڑوں بیوائیں صبر و شکر سے اپنے دن پورے کر رہی ہیں۔ میں

بھی کر سکتی ہوں۔ پرماتما کی طرف سے نازل ہونے والی آفتیں ناقابل برداشت نہیں ہوتیں۔ لیکن خود پیدا کی ہوئی مصیبتیں مضبوط سے مضبوط انسان کی ہمت توڑ دیتی ہیں۔"

"مجھے جلدی بتاؤ" اب میں زیادہ صبر نہیں کر سکتی۔"

"سنو، میری اچھی ممی! میں اس دن جیساکہ آپ کو بتایا تھا چتر نجن سے ملی تھی۔ اس کی بے بسی اور لاچاری میں کوئی ایسی منت تھی جس کو نظر انداز کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ وہ نیک روح اس دنیا میں چند دن کی مہمان تھی۔ کوئی اس کا ساتھی نہیں تھا۔ زندگی کی آخری منزل پر اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کی روح میری روح کے ساتھ مل گئی۔ جس طرح کوئی مصیبت زدہ شخص پردیس میں اچانک کسی ہموطن سے مل جاتا ہے۔ سامنے موت تھی۔ وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں بھی اس کا دل توڑ کر جدا ہونے کے لئے اپنے دل کو آمادہ نہ کر سکی۔ میں سب کچھ سمجھتی تھی۔ خطرے کا مجھے پورا پورا احساس تھا۔ لیکن میں اس دنیا میں سے نکالی جانے والی ہستی کے گلے میں لپٹی ہوئی بانہیں توڑ کر الگ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جانا میں نے قبول کر لیا ...."

کھڑکی میں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ پربھا نے اٹھ کر دہ کھڑکی

بند کر دی۔ ماں رحم اور خوف کا مجسمہ بنی بیٹھی رہی۔

"میں چلی گئی۔ میں اس کے ساتھ موت کے منہ تک جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں نے اس کی زندگی کے باقی ماندہ لمحوں کو محبت سے بھر دیا اور اپنے پرماتما کو گواہ رکھ کر اس کو اپنا پتی چن لیا۔ میں نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا۔ اب وہ اس دنیا سے جا چکا ہے۔ میں کبھی آپ کو اس فکر میں نہ ڈالتی۔ لیکن میرے پاس اس کی ایک امانت ہے...."

"وہ کیا؟" ماں پربھا کے جسم کا جائزہ لے رہی تھی۔

"میرے پیٹ میں اس کا بچہ ہے۔" پربھا کی آواز میں کوئی ندامت یا پشیمانی نہیں تھی۔

لیکن ماں کا رنگ ایک دم اُڑ گیا اور دیکھتے دیکھتے وہ غش کھا گئی۔ پربھا، ماں کو ہوش میں لانے کے لئے اس کے ہاتھ پیر مل رہی تھی کہ اتنے میں راؤ صاحب کی موٹر کی آواز آئی۔ وہ اندر آ کر پربھا سے پوچھنے لگے۔

"کیوں کیا بات ہو گئی؟ کچھ دنوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے پھر دورہ پڑنے والا ہے۔"

"میرے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔"

"کس بارے میں؟"

"صبح ماں جی خود ہی آپ کو بتا دیں گی - ابھی تو ان کو ہوش میں لانا
چاہیئے" ــــ یہ کہہ کر پربھا سونگھانے والی دوا کی شیشی لینے دوسرے
کمرے میں چلی گئی -

پربھا کی ماں نے راؤ بہادر کو سب حالات سے آگاہ کر دیا۔ سُنتے ہی ان کے ہوش اُڑ گئے اور غصّے میں آگ بگولا ہو کر چلّائے۔

"جی چاہتا ہے اسے دریا میں پھینک دوں۔" دونوں میاں بیوی سخت مضطرب اور پریشان تھے۔ ان کے چہروں کا رنگ اُڑ گیا تھا اور آنکھیں پتھرا گئی تھیں لیکن پربھا کی بات کسی کے بھی دماغ میں نہ بیٹھ سکی۔ کہ ایسا کونسا خدائی قہر نازل ہو گیا ہے جو ناقابلِ برداشت ہو۔ اُس نے کوئی چوری نہیں کی۔ ڈاکہ نہیں ڈالا۔ کسی کا خون نہیں کیا۔ کسی کو بُرا نہیں

کہا - اور نہ ہی کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہے - اگر کچھ بُرا کیا ہے تو اپنے لئے
اور اگر کچھ اچھا کیا تو بھی اپنے لئے - اس کی روح پاک ہے جسم تندرست
ہے بُری خواہشات کا اس کے دل میں گذر تک نہیں ہوا - کسی پر قربان
ہو جانے کے لئے کسی کی اُمید بندھانے کے لئے اس نے اپنی زندگی بھینٹ
کر دینے کی ہمّت کی ہے - اور اس نے عمر بھر کی خود ضبطی کے بوتے پر یہ قدم
اُٹھایا ہے - جو کچھ ہوا اچّھا ہوا، جو ہو گا اچھا ہی ہو گا ———— اس میں
اس کا اٹل اعتقاد ہے - اس کو کسی سے کوئی گِلہ نہیں، کوئی رنج نہیں اور
نہ ہی کسی سے کدورت ہے - ماں باپ اور بیٹی ایک دوسرے کی قسمت پر
رحم کھا کر ایک دوسرے سے پیار اور ہمدردی کر سکتے ہیں - ایک دوسرے
کے دُکھ درد میں شریک ہو سکتے ہیں - محبّت کر سکتے ہیں، ڈھارس بندھا
سکتے ہیں - کسی کا کچھ نہیں بگڑا - وہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کے بکھرے
ہوئے ٹکڑوں کو محبّت اور ہمدردی کے ساتھ یکجا کر کے اس کی رُوح کو
تسکین پہنچا سکتے ہیں - اسے اپنا بنا سکتے ہیں -

چترنجن اُن نونہالوں میں سے تھا جن کا سایہ بھی ناپاک ہستیوں کو
پاک کر دیتا ہے - جن کی موجودگی میں کوئی شخص کوئی گندہ لفظ زبان پر لانے
کی جُرأت نہیں کر سکتا - کسی کو بُری آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا - اگر ایسے
نونہال کے ساتھ پربھا کی شادی ہو جاتی تو یقیناً اس کے والدین خوشی سے

پھوڑے نہ سماتے اور اگر شادی کے دو دن بعد وہ بے قصور اسی طرح کے کسی مقدمے میں پھنس جاتا تو پربھا کا باپ اس کی رہائی کے لئے جان تک لڑا دیتا - پانی کی طرح اپنی دولت بہا دیتا اور اگر پھر بھی وہ اُسے موت کے مُنہ سے بچانے میں ناکام رہتا تو وہی ماں باپ پربھا کو گلے لگاتے، اسے ڈھارس بندھاتے اور اس کے ہونے والے بچّے کی خیر مناتے -

اب بھی کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی تھی - سوائے اس کے کہ ایک دنیوی رسم ادا نہیں کی گئی - لیکن پربھا کا خدا کو گواہ بنا کر بیاہ برتنا لینا ان کے نزدیک مقدّس رسم نہیں سمجھا گیا - فرق کیا تھا صرف یہ کہ ایک لاعلم انجان اور بھیک منگے پنڈت نے چند غلط اشلوک نہیں پڑھے جس کی وجہ سے آج پربھا جیسی دیوی کا بے مثال چلن بدچلنی کے مترادف سمجھا جا رہا ہے اور جس شکستہ دل بیٹی کو سینے سے لگا کر اس کو حوصلہ دینے کی ضرورت تھی - اُسے دریا بُرد کرنے کی خواہش کی جا رہی ہے مجلسی رسوم پورا کرنے میں انسان کا اپنا فائدہ ہے - لیکن کبھی کبھی کسی رسم شکنی کو قبول کر لینا معاشرے کے لئے مفید بھی ثابت ہو سکتا ہے!

چند دن بعد راؤ بہادر کا غصّہ کچھ کم ہوا - وہ اتنے دن پربھا سے نہیں ملے تھے - اور نہ ہی پربھا کسی کے سامنے آتی تھی - آخر راؤ بہادر

نے سوچا کہ اس معاملے کے متعلق کسی کو کچھ خبر نہیں - بہتر ہوگا کہ وہ آنے
والے برسات کے موسم میں سیر و تفریح کے بہانے بمبئی چلے جائیں وہاں
کئی قابل ڈاکٹر ہیں جو بڑی بڑی مشکلات کو آسانی سے حل کر سکتے ہیں -
لیکن جب پربھا کی ماں نے اُس کو راؤ بہادر کے ارادے سے
مطلع کیا تو اس نے بڑی نڈرتا سے جواب دیا -
" میں نے پرماتما کو حاضر ناظر جان کر اپنی شادی رچائی تھی - یہ معصوم
ہستی میرے مرحوم پتی کی امانت ہے مجھے کسی قسم کی رسوائی کا خوف نہیں
اگر میں زندہ رہوں گی تو امانت بھی زندہ رہے گی - ورنہ ہم دونوں اس
مرنے والے کی یاد میں جان دے دیں گے "۔
" لیکن پربھا، ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے ؟ ہم تو جیتے جی مر
جائیں گے "۔
" کیا آپ میری سچائی پر اعتماد نہیں کر سکتے - کیا آپ یہ نہیں مان سکتے
کہ میں نے کوئی بھی حرکت خواہشات سے مغلوب ہو کر نہیں کی جو کچھ کیا ہے
صرف قربان ہو جانے کے جذبے سے کیا ہے - میری پیاری اتی یقین کیجئے
میرا دل بالکل پاک ہے "۔
" تم نیک ہو، پاک ہو، میں مانتی ہوں، تمھارے ایک ایک لفظ
کی سچائی کی میں قائل ہوں پربھا! لیکن دُنیا تو نہیں مانے گی "۔

"جانے دیجئے دُنیا کو، ہم دنیا والوں کے ساتھ نہیں رہیں گے۔ ہم تینوں اپنی الگ دُنیا بنالیں گے اور چوتھے ساتھی کا انتظار کریں گے۔ میری رُوح آپ کی احسان مند رہے گی کہ آپ نے میرا ساتھ دیا۔ میں اپنی ساری زندگی آپ کی خوشی کے لئے وقف کر دوں گی۔ وقت گذرنے پر پھر بھلے دن آئیں گے دنیا بدل جائے گی ...."

پربھا کی ماں اس منّت گزاری سے متاثر ہو رہی تھی اس کا نسوانی دل اپنی بیٹی کی بے گناہی کا نہ صرف قائل تھا بلکہ اس کی فراخدلی کا بھی معترف تھا۔ وہ اپنے اس جگر کے ٹکڑے کی رسوائی میں اس کا ساتھ دینے کو رضامند ہو جاتی کہ ٹھیک اسی وقت دروازہ کھُلا اور راؤ بہادر غصّے میں بھرے اندر داخل ہوئے اور کڑک کر بولے۔

"میں نے سب کچھ سُن لیا ہے۔ مارے شرم کے میں ڈوبا جا رہا ہوں پربھا! میں یہ بدنامی ہرگز برداشت نہیں کرسکوں گا۔"

"لیکن پتاجی! آپ فکرمند نہ ہوں۔ آپ کی عزّت اور آبرو پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ اس کا انتظام میں کروں گی۔"

"تم کیا خاک کرو گی۔ جو کچھ کرنا تھا، کر چکی۔"

"خیر یہ آپ خود دیکھ لیں گے۔"

اس بات چیت کو ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ شام کے وقت

پربھا ڈرائیور کو ساتھ لے کر دریا پر گھومنے کے لئے گئی۔ وہ چترنجن والے معاملے سے پہلے بھی دریا پر سیر کرنے جایا کرتی تھی اور موٹر کار کو ایک طرف کھڑا کر کے دریا کے کنارے کنارے چہل قدمی کیا کرتی تھی۔

شام گہری ہو جانے سے ماں متفکر تھی اور پربھا کے لئے اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ جب موٹر گاڑی بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی، لپک کر آگے بڑھیں تو گھبرایا ہوا ڈرائیور فریب فریب چلاتا ہوا بولا۔

"بی بی آج واپس نہیں آئیں۔ میں وہاں انتظار کرتے کرتے تھک گیا پھر ادھر کو گیا جدھر وہ گئی تھیں۔ لیکن دُور تک ڈھونڈنے پر بھی ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ کئی لوگوں سے بھی پُوچھا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ انھوں نے دریا میں سے پانی کا چُلّو بھرا تھا۔ اور بس۔ اس کے علاوہ .... ماں جی! میں نے سُنا ہے وہاں ایک مگرمچھ بھی رہتا ہے ...... ہائے میری اچھی بی بی جی .... میری نیک دل بی بی جی .... آپ کہاں چلی گئیں؟" یہ کہہ کر وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کو اپنی بیٹی کی اُس دن کی بات یاد آگئی۔ فوراً راؤ صاحب کو اطلاع دی گئی۔ ہر طرف کہرام سا مچ گیا۔ راؤ بہادر نے ڈرائیور کو تیاری کا حکم دیا۔ میاں بیوی جب موٹر میں سوار

ہونے لگے تو انھوں نے سیٹ پر ایک لفافہ پڑا ہوا پایا۔ کھول کر دیکھا۔ پربھا کا خط تھا۔ اُسے لے کر وہ انہیں قدموں بنگلے کے اندر چلے گئے۔ کمرے میں پہنچ کر کھولا۔ پڑھتے ہی ہوش اُڑ گئے۔ کاغذ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ ماں کی عینک پاس نہیں تھی۔ اِس لئے اس نے شوہر سے اصرار کیا کہ وہ ہی اسے پڑھ کر سُنائیں۔ لکھا تھا:۔

"پتا جی! مَیں زندہ ہوں یا مُردہ، اب آپ مجھے کبھی نہیں دیکھ پائیں گے۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں۔ میرے ماتا پتا کسی سے بُرے نہیں۔ میں اُن کی شکر گزار ہوں۔ افسوس سے بھری ہوئی ہوں۔ کیونکہ آپ کی تکلیف کا کارن بنی ہوں میں دریا پر دیکھی گئی ہوں۔ یہاں جنگلی جانوروں کا بھی خطرہ ہے۔ مجھے ڈھونڈ کر دیکھ لیجئے گا۔ لاش ڈھونڈنے کے لئے کشتیوں کے پُل پر بھی تار بھیج دیجئے گا۔ اس طرح میری موت کی تصدیق اور خاندان کی عزّت محفوظ ہو جائے گی۔ میری طرف سے محبّت قبول کیجئے۔ میرے دل میں کسی قسم کا رنج نہیں۔ کسی قسم کا غصّہ نہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ لیکن رسوم کا جادو، بہت طاقتور ہے۔ ابھی کئی صدیاں انسانی روح اس کے بے رحم شکنجے میں جکڑی تڑپتی رہے گی۔ بالآخر انسان اِس

بات کو سمجھ سکے گا کہ رسمیں زندگی کو بڑھانے کے لئے ہیں۔
توڑنے کے لئے نہیں "

'آپ کی پربھا'

راؤ بہادر دریا پر پہنچے - چاروں طرف آدمی دوڑائے گئے۔ جنگل چھان مارا۔ لاش کے لئے پہرے لگائے گئے۔ لیکن پربھا کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ 'پربھا کو مگرمچھ نگل گیا' یہ خبر دور دور شہر میں پھیل گئی۔ اخبارات میں بھی شائع ہو گئی۔ رشتہ دار اور واقفکار ماتم پرسی کے لئے آ اکھٹے ہوئے۔
بدنامی اور رسوائی کا خطرہ جاتا رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زندگی کا سہارا بھی غائب ہو گیا۔

جس وقت راؤ صاحب اور ان کے آدمی دریا کے کنارے اور جنگل کے اندر پربھا کو تلاش کر رہے تھے، اس وقت پربھا پیدل چل کر چار میل کے فاصلے پر ایک ریلوے سٹیشن سے دہلی کا ٹکٹ خرید رہی تھی۔

پربھا کی ساڑی ریشمی نہیں تھی بلکہ ایک سادہ اور معمولی سی دھوتی پہنے وہ پیدل وہاں پہنچی تھی۔ غالباً وہ گھر سے چلتے وقت ریشمی ساری کے نیچے یہ دھوتی پہن کر آئی تھی۔ اس نے ساڑی اور بڑھیا پمپ شو دریا میں پھینک دیا ہوگا۔ تاکہ پہچانے جانے کا خطرہ نہ رہے۔ دہلی کافی دور مقام ہونے کی وجہ سے اس کو یقین تھا کہ وہاں اس کو جاننے والا کوئی نہیں ملے گا۔

صبح کا وقت تھا جب پربھا دہلی پہنچی۔ سوچنے لگی کہ اب کہاں جائے اس ملک میں عورت ذات کی تنہائی کا احترام کرنا تو درکنار، عورت کو اکیلا دیکھ کر اس سے کئی طرح کی اُمیدیں وابستہ ہونے لگتی ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا وہ کسی دھارمک آشرم میں چلی جائے۔ لہٰذا وہ دو ہندو آشرموں میں گئی اور وہاں اس نے بتایا کہ وہ ایک غریب بیوہ ہے اور کام کاج کی تلاش میں آئی ہے۔ اتفاق سے ان دونوں آشرموں کے سکریٹری ادھیڑ عُمر کے امیر آدمی تھے۔ جوانی کی مستی میں نفسانی خواہشات تو ضرور ہوتی ہیں لیکن جوان دلوں میں ہمدردی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ جوانی ڈھل جانے کے بعد اکثر اوقات انسان ضرورت سے زیادہ خودغرض اور حریص ہو جاتا ہے۔ کسی کو کچھ دینا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے اور وہ ہر ایک چیز کو حرص و آز کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔

پربھا کو ان دونوں جگہوں سے مایوسی ہوئی۔ کیونکہ دونوں منتظمین کی نظروں سے خودغرضی ٹپکتی تھی۔ پربھا کی جوانی کو دیکھ کر جو بُری خواہشات ان کے دلوں میں پیدا ہوئیں انھیں وہ چُھپا نہ سکے۔

پربھا نے پٹنہ میں سکھوں کا ایک مندر دیکھا تھا اور اس نے گورو نانک صاحب کے کئی اقوال کا ترجمہ شاعر ٹیگور کی سنگیت بھری زبان میں پڑھ رکھا تھا۔ اس لئے اس کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ سکھ

دھرم صرف ہندو دھرم کی اصلاح ہی نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کے لائل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ کیونکہ گورو نانک کے شبدوں میں جینؤ، سُوتک، ذات پات، پُوجا، نماز، برت، روزے، آرتی، تیرتھ اور اشنان وغیرہ سب رسمیں ہیں۔ اصل شئے خود نیک بننا اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔

اس نے گورو گوبند سنگھ صاحب کی روحانی تعلیم کے زیر اثر کمزور اور گئے گذرے غلام آدمیوں کا سکھوں جیسی بہادر قوم میں تبدیل ہو جانا بھی پڑھا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سکھ تواریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے آنسو بھی بہائے تھے اور اُسے یاد تھا کہ ان کی قربانی اور بہادری نے کس طرح غلامی میں جکڑی ہوئی بے بس قوم کو ازسرِ نو خودداری سکھائی تھی۔ اس کے نزدیک سکھ تیاگ اور قربانی کے مجسمے تھے۔

پوچھتے پوچھتے وہ ایک گوردوارے میں پہنچی۔ اُس وقت وہاں کیرتن ہو رہا تھا جس سے وہ بہت محظوظ ہوئی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ پُوجا کی رسمیں وہاں بھی ہندو مندروں سے کم نہ تھیں۔ دیوان برخاست ہوتے ہی وہ گرنتھی صاحب کے پاس گئی۔ ان کے پاؤں چھوئے۔ انھوں نے آشیرباد دے کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ پربھا نے انھیں اپنی مصیبت کا جتنا حال وہ بتا سکتی تھی بتایا۔ اس کا اعتماد بھائی صاحب پر ہندو صلوٹوں

کی نسبت قدرتی طور پر زیادہ تھا۔ کیونکہ ان کی صورت میں سچے دعوے کی عظمت تھی۔ رحم اور ہمدردی کی اُمید پر پربھا نے اپنی بیکسی کا حال بتاتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ اسے کسی خدمت کے بدلے میں پناہ دی جائے صرف پناہ، تاکہ اس کی جوانی لوگوں کی حریص نظروں کا شکار نہ ہو۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بھائی صاحب کا نوجوان لڑکا کسی کام سے ادھر آنکلا۔ جن حریص نظروں سے بچنے کے لئے پربھا پناہ مانگ رہی تھی، وہی نظریں اس پر گڑ گئیں۔ یہ نوجوان باتیں تو اگرچہ اپنے باپ سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں پربھا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں وہ پربھا کے بارے میں پوچھے بغیر بھی نہ رہ سکا۔ بھائی صاحب نے ٹیڑھی نظروں سے گھور کر کسی طرح اپنے لڑکے کو وہاں سے رخصت کیا۔ پھر بڑے ہمدردانہ لہجے میں انھوں نے پربھا کو اُمید دلائی کہ وہ اس کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھیں گے اور ہر طرح سے اس کی مدد کریں گے۔ لیکن باتوں باتوں میں انھوں نے یہ اشارہ بھی کر دیا کہ ان کا وہ نوجوان لڑکا ابھی کنوارہ ہے اور بڑا ہی نیک لڑکا ہے۔ پربھا اس گفتگو کے بعد اپنا سامان لانے کی اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔

بھائی صاحب اگر اپنے لڑکے کے خیال کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی پربھا کی اس وقت کی مایوسی کو دیکھ پاتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ وہ واپس

آنے کے ارادہ سے نہیں جا رہی تھی ۔ بلکہ جس چیز کو اس نے اصلی ہیرا سمجھا
تھا اس کی بناوٹ میں سے اسے اس کے نقلی ہونے کا احساس ہو گیا تھا ۔

وہ وہاں سے چلی آئی ۔ لیکن ابھی وہ وہاں سے نجات پانے کا اطمینان
بھی حاصل نہ کر سکی تھی کہ اس نے دیکھا، ایک کرپان والا سکھ اس کے تعاقب
میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا چلا آ رہا ہے ۔ وہ ایک موڑ پر سے دوسری
طرف مڑنے ہی کو تھی کہ اس سکھ نے اس کو رکنے کے لئے آواز دی ۔
پہلے تو پربھا اس کو بھائی صاحب کا لڑکا سمجھ کر ڈر گئی ۔ لیکن جب وہ قریب
پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ کوئی دوسرا شخص تھا، جس نے پربھا اور بھائی
صاحب کی باتیں سن لی تھیں ۔

اس سکھ نے پربھا کو ایک طرف لیجا کر سمجھایا کہ گرنتھی کا لڑکا بڑا بدچلن
اور شرابی ہے، وہ اس کے جھانسے میں نہ آئے ۔ پھر اپنی تعریف کرتے ہوئے
اس نے خیال ظاہر کیا کہ وہ ذات پات کے بندھنوں سے آزاد ہے اور
اسی دن پربھا کے ساتھ شادی کر لینے کے لئے بھی تیار ہے ۔ پربھا کو سن
کر بہت رنج ہوا ۔ اور ساتھ ہی افسوس ہوا کہ اس نے کیوں شہد کی مکھیوں
کے اس چھتے کو چھیڑا ۔ لیکن اپنے غصے کو دباتے ہوئے پربھا نے اس سکھ
کو یقین دلایا کہ وہ گوردوارے کے گرنتھی کے پاس واپس نہیں جائے گی ۔

دوسرے صوبے کی ایک نوجوان لڑکی کو سکھ کے پاس کھڑا دیکھ کر ایک

اورسکھ اُن کے پاس آ پہنچا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی کچھ تھا جو پہلے کی آنکھوں میں تھا۔ پربھا بڑی چکرائی کہ وہ کیسی اُلجھن میں پھنس گئی ہے۔ اس نے سڑک کے موڑ کی طرف نظر گھمائی۔ وہاں پولیس کا ایک سپاہی کھڑا تھا اور کچھ فاصلے پر زنانہ مشن ہسپتال کا بورڈ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پربھا فوراً سپاہی کے پاس پہنچی اور اس نے کہا کہ بیمار ہونے کی وجہ سے وہ کسی زنانہ ہسپتال میں جانا چاہتی ہے سپاہی نے راستہ بتا دیا۔ راستہ تو اس نے خود ہی معلوم کر لیا تھا لیکن وہ سپاہی کی آڑ لینا چاہتی تھی تاکہ وہ سکھ اُس کا مزید تعاقب کرنے کی جُراُت نہ کرے۔

پربھا کو یہ ہسپتال ایک قلعے کی طرح معلوم ہوا۔ مہتر، چپراسی وغیرہ ملازمین کے علاوہ وہاں کوئی مرد نہ تھا۔ نرسوں اور لیڈی ڈاکٹروں کے چہرے اُمید افزا تھے۔ پربھا نے ہیڈ میٹرن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک نرس اسے بڑی مس صاحبہ کے بنگلے پر جو ہسپتال کے احاطے میں ہی تھا، لے گئی۔ بڑی میٹرن باہر برآمدے میں بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ اس نے پربھا کو اپنے پاس ہی کرسی پر بٹھا لیا۔ کچھ کھانے کے لئے پیش کیا تو پربھا نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ میٹرن ناشتہ کرتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ پربھا سے گفتگو بھی کرتی رہی۔ اس نیک خاتون کا رویہ اس قسم کا تھا کہ پربھا نے اسے اپنی داستان بلا کم و کاست کہہ سنائی اور اس سے مناسب امداد

کی درخواست کی۔

"جو کچھ ہو سکتا ہے۔ ہمارا مشن آپ کے لئے ضرور کریگا"۔ میم صاحبہ نے کہا۔ "اور اگر آپ اس طرح سے سب کے ساتھ قطع تعلقات کر کے آئی ہیں تو میں آپ سے کہوں گی کہ آپ عیسائی مذہب اپنا لیں پھر آپ کو پوری طرح پناہ مل جائے گی"۔

"کیا مذہب بدلے بغیر آپ میری مدد نہیں کر سکیں گی؟" پربھا نے پُوچھا۔

ضرور کر سکیں گے، مذہب بدلنا خاص ضروری نہیں۔ لیکن آپ کی ہر طرح کی پناہ کے لئے شاید یہ تبدیلی بہتر ثابت ہوتی"۔ میٹرن نے جواب دیا۔

"اگر ضروری نہیں میم صاحبہ!" پربھا نے کہا۔ "تو ابھی آپ مجھے کسی تبدیلی کے لئے نہ کہیں۔ میں آپ کے ہمدردانہ سلوک کی بدولت خود بخود تبدیل ہو جاؤں گی"۔

"جیسی آپ کی مرضی، ہماری خدمت کے دروازے آپ کے لئے کھُلے ہیں۔ ہاں کھانے پینے کے سلسلے میں آپ کو ضرور تکلیف ہو گی"۔ میٹرن نے ایک بار پھر پربھا کو ترغیب دیتے ہوئے کہا۔

"کھانے پینے کا مجھے کوئی پرہیز نہیں ہے۔ میں گرجا بھی جایا کروں گی۔

جو کتابیں آپ مجھے دینگی میں ان کا بھی مطالعہ کروں گی۔ کسی ہندو پوجا پاٹھ کی دُہائی دے کر اس احاطے میں رہنے والی عیسائی بہنوں کی باتوں کا نشانہ بھی نہیں بنوں گی آپ میم صاحبہ!" پربھا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "خاطر جمع رکھیں میں اسی طریقے کا رہن سہن اختیار کرلونگی جس طریقے کا یہاں دستور ہے صرف ظاہرا تبدیلی سے میرا ضمیر انکار کرتا ہے"!

"تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں"۔ میٹرن نے خوش ہو کر کہا۔ "مجھے فکر صرف اس بات کی تھی کہ آپ کا انوکھا اور مختلف رویّہ کئی زبانوں کو حرکت دے گا اور یہ زبانیں آپ کی زندگی کو بدمزہ اور میرے نظام کو ناقص بنادینگی"۔

"اس بات کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اگر میری وجہ سے آپ کے نظام میں کوئی گڑبڑ ہوگی۔ تو میں فوراً یہاں سے چلی جاؤں گی اور ہمیشہ آپ کی مہربانی کے لئے آپ کی احسان مند رہوں گی۔ لیکن کیا آپ میرے حالات سے پوری طرح واقف ہو گئی ہیں؛ میرے پیٹ میں بچّہ بھی ہے"!
پربھا یقین کرنا چاہتی تھی کہ کوئی معمولی سی غلط فہمی بھی باقی نہ رہ جائے۔

"ہاں، میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ میں آپ کی پوری پوری مدد کرونگی اس احاطے کے اندر، باہر کی زبانوں کا کوئی اثر نہیں۔ آپ اپنے ساتھیوں کی ہمدردی حاصل کئے رکھیں۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا"! میٹرن نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد پربھا اور میٹرن باغ میں چہل قدمی کرتی رہیں۔ میٹرن پربھا کی سُوجھ بُوجھ اور اس کے تجربات سے واقف ہوکر بہت خوشی محسوس کر رہی تھیں۔ پربھا کو تمام پھولوں کے نام معلوم تھے اُس نے علم نباتات کا بھی مطالعہ کیا ہوا تھا اور انگریزی علم و ادب کے علاوہ انگریزی تاریخ سے بھی خاصی واقفیت رکھتی تھی۔

میٹرن نے اپنی اسسٹنٹ کو بلایا اور اس سے صلاح مشورہ کر کے پربھا کے لئے ایک عمدہ سا کمرہ مخصوص کرنے کے ساتھ ساتھ اسے نرس کا کام سکھانے کا بطورِ خاص انتظام کر دیا۔

ایک دو مہینے کے اندر اندر پربھا نے ثابت کر دیا کہ وہ اس احاطے میں سب سے زیادہ ہوشیار لڑکی ہے۔ وہ خوش خلق اور خوش اطوار تھی اس کا رویہ مکمل عیسائیت تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ ہاں وہ عیسائیوں کی طرح قسمیں نہیں کھاتی تھی اور نہ ہی یسوع مسیح یا مریم کی تصویر کے آگے ماتھا رگڑتی تھی۔ وہ اوّل الذکر کو خدا کا اکلوتا بیٹا اور مؤخر الذکر کو کنواری ماں بھی نہیں مانتی تھی۔

اب پربھا باہر شہر میں بھی جانے آنے لگی اُس کو کسی طرح کی تکلیف نہیں تھی۔ عیسائی شکل وصورت والی لڑکیوں سے ہندوستانی غنڈے بھی کسی قسم

کی آزادی لینے سے خوف کھاتے ہیں ۔ ایسے ہندوستانیوں کو خود سے دُور رکھنے کے لئے ہیٹ لگا لینا یا گاؤن پہن لینا کافی ہے ایک معمولی سے ہیٹ والے کو یہ لوگ اپنے آپ ہی سلام کر دیتے ہیں ۔ لیکن پگڑیاں چاہے ریشمی ہی کیوں نہ ہوں، اُچھالنے سے باز نہیں آتے۔

پربھا کا بچّہ اس دُنیا میں آگیا ۔ یہ لڑکا تھا ۔ پورے احاطے میں خوشی منائی گئی ۔ پربھا کی صحت بھی اچھی تھی ۔ میٹرن ہر روز اس کی مزاج پُرسی کے لیے آتی تھی ۔ اس کی باقی ساتھیوں نے بھی اس کے ایّامِ زچگی کو آرام دہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ۔

پربھا بھی بہت خوش تھی ۔ جب گھڑی دو گھڑی کے لئے اس کی نرس کسی کام سے باہر جاتی اور وہ تنہا ہوتی تو بچّے کو پالنے میں سے نکال کر اپنے پہلو میں لٹا لیتی اور اس کی بند آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ——

" چترنجن! یہ آپ کی آنکھیں ہیں ۔ ہو بہو میرے چترنجن! یہ آپ کے پیارے پیارے بال ہیں ۔ وہ ایسے ہی سیاہ اور گھنے تھے ۔ میں اس کا کیا نام رکھوں؟ جی چاہتا ہے اسے چترنجن ہی پکاروں ۔ کیا لڑکوں کے نام باپ جیسے نہیں ہو سکتے ۔ بڑے ہو کر بیٹے اپنے باپ کے مشابہ ہو جاتے ہیں ۔ یہ بھی چترنجن جیسا ہو جائے گا ۔ ویسے ہی کھُلے اعضا اور ویسا ہی وسیع دل ۔ میں اس کی جوانی کو گلے سے لگاؤں گی ۔ لوگوں کی نظروں میں یہ

میرا بیٹا ہوگا۔ لیکن میری نظر میں یہ میرا چترنجن ہوگا (بچے کا ماتھا چوم کر) اب میں بیوہ نہیں ہوں (پھر چوم کر) چترنجن مجھے مل گیا۔ میں اب بیوہ نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔"

اتنے میں نرس آجاتی اور بچے کو گود میں لے کر پربھا کو ہلکی سی ڈانٹ بتاتی۔

"میں نے آپ کو کئی مرتبہ کہا ہے کہ آپ بستر سے اٹھ کر بچے کو پالنے سے نہ نکالا کریں آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ کہیں کوئی تکلیف ہو گئی۔۔ تو۔۔۔۔۔۔"

"اچھا، پھر ایسا نہیں کروں گی۔ اب معافی دے دیں"۔ پربھا نرس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں پر رکھ لیتی۔ اس کا دل ہر کسی کو چومنے کو چاہتا تھا۔ شاید اسی لئے لوگ زچہ کو نیک شگون خیال کرتے ہیں۔ سرسبز ٹہنی کی طرح ہری بھری گود بھی کومل اور ملائم ہوتی ہے اور اس کی گفتگو میں سے خوشنما ثمر کی خوشبو آتی ہے۔

پربھا کا بچہ پوری تندرستی کے ساتھ بڑا ہو گیا۔ وہ تمام احاطے کا کھلونا تھا۔ پربھا اپنے کام میں اور بھی ہوشیار ہو گئی۔ اس نے نرسنگ کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ سلیقہ مند تو وہ پہلے سے تھی صرف امتحان پاس کرنے کی کمی تھی۔ جب یہ پوری ہو گئی تو میٹرن نے اسے ہیڈ نرس بنا دیا۔

یہ ترقی اس کے لئے مفید ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ ہر دلعزیز تھی اور اب دو تین نرسوں کے حسد کی وجہ بن گئی۔ وہ اس کا کچھ بگاڑ تو نہ سکتی تھیں۔ لیکن ان کی محبّت کی عدم موجودگی کو وہ بری طرح محسوس کرتی تھی۔ پربھا نے دو تین بار میٹرن سے درخواست کی کہ اُسے اسسٹنٹ نرس بنا دیا جائے لیکن میٹرن اس کے بجائے حاسد نرسوں کے خلاف ہوتی گئی۔ یہ بات بھی پربھا کے لئے بُری سی ہوئی۔ جب میٹرن کے ریٹائر ہونے کا وقت قریب آگیا۔ تو پربھا نے ایک بار پھر اس سے درخواست کی کہ وہ جانے سے پہلے اس کو اسسٹنٹ نرس بنا دے۔ لیکن میٹرن نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا کہ وہ جاتے وقت سب معاملہ نئی میٹرن کو سمجھا دے گی۔

نئی میٹرن آگئی۔ لیکن اس کا دل بہت پُرانا تھا۔ پرانے دلوں والے جب کوئی نیا عہدہ سنبھالتے ہیں تو اکثر اوقات بغیر کسی سبب کے وہ ان ماتحتوں کے خلاف ہو جاتے ہیں جو پہلے عہدہ داروں کے منظور نظر ہوں۔ قصّہ مختصر یہ کہ وہ پہلے عہدہ داروں کی تعمیر کو ڈھا کر اپنی نئی تعمیر شروع کرتے ہیں۔

حاسد نرسوں کی شنوائی ہو گئی۔ پربھا نئی میٹرن کی خوشنودی نہ حاصل کر سکی۔ ہر روز ایک دو شکائتوں کی اس سے جواب طلبی ہوتی تھی۔

غیر مطمئن ماتحت سے کام لینا بہت بدمزا ہو جاتا ہے لیکن ناراض افسر کے ماتحت کام کرنا تو دوزخ میں پڑنے کے مترادف ہوتا ہے۔

پربھا ہسپتال چھوڑ دینا چاہتی تھی لیکن اس کا بچہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔ ابھی صرف دوسری سالگرہ ہی تو منائی گئی تھی اس لئے بچے کے ہوش سنبھالنے تک اس نے سب کچھ برداشت کرتے ہوئے وہاں کچھ دن اور کاٹنے کا ارادہ کر لیا۔ جب میٹرن نے اس کو ہیڈ نرس سے اسسٹنٹ نرس کر دیا تو بھی اس نے بُرا نہیں مانا۔ کیونکہ اسسٹنٹ بننے کی تو وہ خود خواہشمند تھی۔ لیکن اس تبدیلی کے باوجود حاسد نرسوں کے حسد میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ پربھا کی تو نیکی بھی حسد پیدا کرتی تھی۔

ایک دن میٹرن نے پربھا کو بُلا کر کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم عیسائی نہیں ہو۔"

"جی ہاں میں نے بپتسمہ تو ابھی نہیں لیا۔" پربھا نے جواب دیا۔

"تو پھر تم کب لوگی؟" میٹرن نے پوچھا۔

"میں ابھی اپنے آپ کو اس کے لئے تیار نہیں کر سکی۔"

"تمھیں جلد ہی اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا۔"

"پچھلی میٹرن صاحبہ نے کہا تھا کہ مذہب تبدیل کرنا میرے لئے کوئی ضروری نہیں ہے۔"

"یہ رائے ان کی ہوگی۔ اب یہاں میں میٹرن ہوں میں کسی غیر عیسائی
کو عیسائی پر ترجیح نہیں دے سکتی دو نیک عیسائی عورتیں اس عہدے
سے محروم ہیں۔ صرف اس لئے کہ ایک غیر عیسائی ان کے حق پر قابض ہے
تمہیں ایک ہفتے کے اندر اندر اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا........"
—— میٹرن نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

ہفتہ گذر گیا اور پربھا نے فیصلہ کر لیا۔ اس بات کو وہ مانتی تھی۔ کہ
مذہب پرست ہندو مذہب پرست سکھوں یا عیسائیوں سے کسی طرح بہتر
نہیں ہیں اور عیسائی برادری میں سکھوں اور ہندوؤں کی بہ نسبت کہیں زیادہ
آزادی ہے۔ لیکن رسمی بپتسمہ اس کی نظر میں اسی قدر ناقابل قبول تھا۔ جس قدر
شدھی یا امرت پرچار۔ وہ اس بات کو بھی مانتی تھی کہ جو پناہ اسے عیسائی
برادری میں مل سکتی تھی وہ اپنی برادری میں ہرگز نہیں مل سکتی اور اسے ان بُرے
حالات کا بھی پورا پورا احساس اور خوف تھا جو اس کی جوانی اور اس کے
حُسن کی وجہ سے اس کی برادری کی شریفانہ بداخلاقی سے پیدا ہو سکتے تھے۔
لیکن پربھا کی ساخت کچھ ایک ایسے خمیر سے ہوئی تھی جسے دنیا کی کوئی طاقت
اس کے فیصلے سے متزلزل نہ کر سکتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی دینوی رسوم
یا رسمی مذاہب کی قید میں پڑ کر اپنے دل و دماغ کی آزادی کو سلب کرانے
پر رضامند نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑی دلجمعی سے میٹرن کو اپنا
فیصلہ سنا دیا اور مشن والوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔

دہلی میں جن لوگوں سے پربھا کی جان پہچان ہوئی تھی وہ سب اسے عیسائی سمجھتے تھے۔ اس لئے اسے وہاں کسی کام کے ملنے کی اُمید بہت کم تھی۔ پچھلے ڈیڑھ پونے دو برس میں اس نے پنجابی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ مشن میں اس کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ اس لئے نقد تنخواہ کچھ زیادہ نہ ملتی تھی۔ پھر بھی دو سو روپیہ اس نے پس انداز کر لیا تھا۔ اس نے اپنے وطن کی طرف واپس لوٹنا مناسب نہ سمجھا اور پنجاب کے سب سے بڑے شہر لاہور کا رُخ کیا۔

لاہور پہنچ کر سب سے پہلے قیام کا سوال پیدا ہوا۔ دھارمک آشرموں

میں جانے کا تلخ تجربہ اسے پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ ایک
اچھے اور مشہور ہندو ہوٹل میں جا کر ٹھہری لیکن وہاں بھی وہ دو ہی دن میں
عاجز آ گئی ۔ لاہور والوں کی آنکھوں نے گستاخی میں سب کو مات کر دیا۔
اُس نے ملازمت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔
کیونکہ نرس کا کام مشن یا سرکاری ہسپتال ہی میں مل سکتا ہے۔ اوّل الذکر میں
وہ جانا نہ چاہتی تھی اور موخر الذکر میں ملازمت کے لئے سفارش کی ضرورت
تھی۔ بالآخر اُس نے نرس بننے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ اور زنانہ اسکولوں
میں اُستانی کی آسامی تلاش کرنے لگی ۔ ادھر ہوٹل کا قیام اس کے لئے روز
بروز پریشان کن ہوتا جا رہا تھا ۔ ہوٹل کے سارے عملے کی زبان پر طرح
طرح کی داستانیں تھیں جنھیں سُن کر کالج کے لڑکے اس ہوٹل میں آنے لگے۔
آخر ایک صبح ہوٹل کا بل چکا کر وہ ایک انگریزی ہوٹل میں اُٹھ گئی۔ اس کے
پاس وہاں زیادہ دنوں تک قیام کرنے کے لئے پیسے تو نہیں تھے ۔لیکن
عقل اور تہذیب کافی تھی ۔ وہاں کسی نے اس سے کوئی گستاخ سوال نہیں کیا۔
اور نہ ہی کسی نے اس کی طرف ٹکٹکی لگا کر گھورا ۔ احترام کے ساتھ کلرک نے
مطلوبہ اطلاع بہم پہنچائی اور میڈ (ملازمہ) نے کمرے میں آرام سے پہنچا دیا۔
اور چترنجن کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی ۔ پربھا اپنے بیٹے کو چترنجن کہہ
کر پکارتی تھی اور اپنے شوہر کا نام داس گپتا بتاتی تھی ۔کیونکہ یہی اس کا خاندانی

نام تھا۔

وہ کئی ہندو اسکولوں میں گئی مگر کہیں کام نہ بنا۔ جہاں جہاں انتظام ہیڈ استانیوں کے ہاتھ میں تھا وہاں سے تو اسے فوراً کورا جواب مل گیا۔ سب نے یہی کہا کہ اگر وہ ٹرینڈ ہوتی تو وہ ضرور اسے ملازمت دے دیتیں لیکن اصل بات کا پربھا کو بعد میں احساس ہوا کہ ادھیڑ عمر کی عورتیں کسی نوجوان اور خوبصورت عورت کو اپنے نزدیک رکھنا پسند نہیں کرتیں۔ اس نے دوسرے فرقوں کے مدرسوں میں کوشش کرنے کا ارادہ کیا۔ اقلیتی فرقوں میں تعلیم زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے زنانہ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر مرد تھے۔ ان اسکولوں میں اس کے ساتھ برتاؤ تو اچھا ہوا۔ ہیڈ ماسٹروں نے اس سے بڑی اچھی گفتگو کی۔ لیکن اُن کی آنکھوں کی گستاخی قطعی طور پر ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے کہیں بھی اس کے دل کو اطمینان نہ ہوا۔

ادھر ہوٹل کے اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کا جمع جتھا بھی تیزی کے ساتھ کم ہوتا جارہا تھا۔ یہ بھی کوئی کم فکر والی بات نہ تھی اور جہیز بچن کی ضروریات کم کرنے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ تھی۔ آخر ایک قومی اسکول میں ملازمت مل ہی گئی اور جس کے ہیڈ ماسٹر صاحب ایک عیال دار شریف اور ہمدرد انسان تھے۔

پربھا کی تیز فہمی، محنت اور خوش اخلاقی نے یہاں بھی نام پیدا کر لیا۔ چند

دنوں میں ہی وہ طالبات کی محبوبہ، ہیڈ ماسٹر کی معاون اور اسکول کی رُوحِ رواں بن گئی ۔

لیکن قومی اسکولوں کا خدا ایک نہیں ہوتا ۔ پردھان، سکریٹری، کمیٹی کے ممبران کے علاوہ چندہ دینے والے سب لوگ ملازمت دینے یا ملازمت سے برخاست کرنے کا اختیار اپنا حق سمجھتے ہیں ۔ اس اسکول کے ساتھ تعلق رکھنے والا ہر شخص اسکول کے عملے کو اپنے گھر کا ہی عملہ سمجھتا تھا ۔

اسکول کمیٹی کے پردھان جی دھارمک شہرت کے مالک ایک ایسے بزرگ تھے ۔ جن کے متعلق کئی استانیوں کے سلسلے میں طرح طرح کی باتیں سُنی جاتی تھیں ۔ لیکن ان کی مذہبی سرگرمیوں اور اچھا مقرر ہونے کی وجہ سے ان کے اعمال پر سے پردہ اٹھانے کی کسی کو جُرأت نہ ہوتی تھی ۔ کوئی نہ کوئی اُستانی ان کے بچّوں کو پڑھانے کے لئے ان کے گھر پر ضرور جایا کرتی تھی ۔ پربھا کو دیکھ کر انھوں نے کئی مرتبہ استانی بدلنے کے بارے میں سوچا لیکن بعض ذاتی وجوہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں مانع تھیں ۔ حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ وہ پہلی استانی کو آسانی کے ساتھ اس کے فرائض سے سبکدوش نہیں کر سکتے تھے ۔

امتحانات کے بعد اُس استانی کی کلاس کے نتائج اچھے نہ نکلے اور نہ ہی پردھان کے بچّے امتحان میں پاس ہو سکے ۔ قصُور اگرچہ ان کا اپنا تھا جنھوں نے استانی کو بچّوں کے پڑھانے کی کبھی فرصت ہی نہ دی تھی ۔ لیکن اس سے

بہانہ بہت اچھا ہاتھ لگ گیا - اور استانی کو جواب دے دیا گیا - اس نے بدنام کرنے کی دھمکی دی - لیکن پردھان جی کی مذہب پرستی اور شرافت کی شہرت مضبوط بنیادوں پر کھڑی تھی - اس لئے بدنامی کا خمیازہ بھی استانی کو ہی بھگتنا پڑا -

اب پربھا کو حکم ہوا کہ وہ پردھان جی کے بچّوں کو اُن کے گھر جا کر پڑھایا کرے - پربھا نے اپنے ہمدرد ہیڈ ماسٹر سے مشورہ کیا - پربھا ان دنوں ایس اے وی کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی اور امتحان میں بہت تھوڑے دن باقی تھے - پردھان جی نہایت منتقم مزاج آدمی تھا - انکار کرنے پر اگر اسکول کی ملازمت سے بھی برخاست کر دے تو کوئی بڑی بات نہ تھی - پربھا کی کلاس کے اچھے نتائج کو بھی کوئی خاطر میں نہ لائے گا - لہٰذا ہیڈ ماسٹر نے یہی مشورہ دیا کہ جیسے تیسے ایس - اے، وی کے امتحان تک گذر کرنے کی کوشش کرے -

پربھا نے پردھان جی کے بچّوں کو پڑھانا شروع کر دیا لیکن پندرہ دن کے اندر ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اس اسکول میں جن شرائط پر ایک نوجوان اُستانی ملازم رہ سکتی ہے، وہ اس سے پوری نہ ہو سکیں گی - لیکن وہ اس مایوسی سے بھی کسی بہتر شگون کی توقع کرتی رہی -

روز بروز پردھان جی کا بچّوں کے کمرے میں آنا جانا زیادہ ہوتا گیا - بچّے پربھا سے اتنے سوالات نہیں پوچھتے تھے - جتنے وہ پوچھنے لگے -

اسکول کا معائنہ بھی اب اُنھوں نے ہفتے میں دو بار کرنا شروع کر دیا - اور
پربھا کی کلاس سے بھی ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا -

پربھا کے ساتھ انھوں نے تھوڑی بہت آزادی لینا بھی شروع کر
دی - لیکن پربھا نے چونکہ پنجابیوں کی نسبت زیادہ آزاد ماحول میں پرورش
پائی تھی، اس لئے اس نے ان باتوں کی چنداں پروانہ کی - وہ چاہتی تھی کہ
کسی نہ کسی طرح اپنے امتحان تک وقت گذار سکے -

ادھر پربھا کے سڈول جسم، اس کے چہرے کی ملاہیت، اس کے
خط و خال کی نزاکت، اس کی شیریں گفتگو، اس کی سُوجھ بُوجھ اور اس کے آزادانہ
وطیرے نے پردھان جی کے بے قابو دل میں خواہشات کا ایک طوفان
برپا کر دیا -

چنانچہ ایک شام جب پربھا بچوں کو پڑھانے کی غرض سے ان کے
گھر پہنچی تو بہت دیر تک بچے پڑھنے کے کمرے میں نہ آئے - کافی انتظار کے
بعد وہ کسی نوکر کو آواز دینے جا رہی تھی کہ پردھان جی اندر داخل ہوئے -
بچّوں کے بارے میں پوچھنے پر انھوں نے مسکرا کر جواب دیا -

" وہ تو کل سے اپنی والدہ کے ساتھ ننہال چلے گئے ہیں "
پربھا نے گِلہ کرتے ہوئے کہا " آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ مجھے اطّلاع
کروا دیتے "

"میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ یہاں نہ آئیں"۔ وہ پھر مُسکرائے۔

پربھا نے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا وقت بچ جاتا اور میں اپنی پڑھائی کر لیتی"۔

پردھان نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیتے ہوئے کہا۔ "کیا حرج ہے، اگر بچے یہاں نہیں ہیں۔ آج آپ ان کے باپ کو ہی پڑھا دیں"۔ پردھان کی آنکھوں میں کسی سازش کی جھلک تھی۔

پربھا کو شبہ ہوا کہ شاید اُس نے دانستاً اپنے بیوی بچّوں کو اپنی سُسرال بھیج دیا ہے۔

"وہ کب تک واپس آجائیں گے؟" پربھا نے پُوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا"۔

"جب وہ آجائیں تو مجھے اطّلاع کروا دیجئے گا"۔ یہ کہہ کر پربھا اپنا بیگ لئے بغیر ہی چل دی۔ لیکن پردھان نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"تشریف رکھئے"۔

"نہیں میں جانا چاہتی ہوں"۔ پربھا نے غصّے کا اظہار کئے بغیر مضبوطی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ کیا آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں؟" پردھان نے گھور کر کہا۔

"بالکل نہیں۔ لیکن میں یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی"۔

"آپ کو ٹھہرنا ہوگا"۔ پردھان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"میں نہیں ٹھہر سکتی"۔ یہ کہہ کر پربھا دروازے کی طرف بڑھی۔

"آپ ہرگز نہیں جا سکتیں"۔ کہتے ہوئے پردھان اُسے بازو سے پکڑ کر پھر واپس لے آیا۔ پربھا بھی بازو چھڑانے کی کوشش کئے بغیر لوٹ آئی۔

اب پردھان نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور بولا۔

"اب آپ سمجھ گئی ہونگی کہ میں نے کبھی کسی کو اپنی بات رد کرنے کی اجازت نہیں دی۔ آپ کو آج رات یہیں رہنا ہوگا"۔

"ہرگز نہیں"۔ پربھا پھر دروازے کی طرف چل دی۔

پردھان نے پھر جا پکڑا۔ اب کے بھی پربھا نے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اور اس کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔

"یہ تم نے کیا مذاق بنا رکھا ہے؟ تم یہاں سے نہیں جا سکتیں"۔ پردھان نے جھنجھلا کر کہا۔ اور ہاتھوں کے ساتھ ایک دو گستاخیاں کیں لیکن ان گستاخیوں سے بھی پربھا کے صبر اور اس کی برداشت میں فرق نہ آیا۔ اس نے ذرّہ برابر پروا نہ کی کہ اس کا ہاتھ کہاں چھوتا ہے۔ نہ تو اس نے ہاتھ کو جھٹکا اور نہ ہی چلّائی۔ جیسے کوئی پتّھر کا بُت کسی مشین کے ذریعے بات چیت کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پربھا نے کہا۔

"آپ سو بار پکڑ پکڑ کر لے آئیں۔ لیکن آپ مجھے یہاں روک نہیں سکتے۔

آپ میرے جسم پر بُری نظر ڈالیں ۔ ہاتھوں سے گستاخیاں کریں یا ظالموں کی طرح باہیں مروڑیں ۔ میں کچھ نہیں کہوں گی ۔ لیکن آپ مجھ سے اپنی ناجائز خواہش پوری نہیں کر سکتے ۔ مکان آپ کا ہے، رات آپ کی ساتھی ہے ۔ مجھ میں طاقت نہیں ۔ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں ۔ باہیں توڑ دیں ۔ چہرہ اور چھاتی نوچ لیں اور جو زیادتی چاہیں کرلیں ۔ لیکن یاد رکھیں آپ میری عصمت کو نہیں چھو سکتے ۔"

" میں نے تمھارے جیسی کئی ایک کی عصمت نہ صرف چھوئی نہیں بلکہ خراب کی ہے توڑی مروڑی ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دی ہے ۔ تم کس باغ کی مُولی ہو ؟" پردھان نے اپنی حیوانیت کے زعم میں پربھا کو زور سے بھینچتے ہوئے کہا ۔

" آپ نے خراب نہیں کی ہوگی اور نہ ہی آپ میں اتنی ہمّت ہے ۔ وہ بیچاریاں مجبُور ہونگی اور خود ہی گر گئی ہونگی ۔ پربھا مر سکتی ہے جسم کا ہر حصّہ تڑوا سکتی ہے لیکن اپنی عصمت پر آنچ نہیں آنے دے گی ۔ میری تو زندگی ہی سماج کے ظلموں کا امتحان لینے کے لئے وقف ہے آپ اور آپ کی یہ نام نہاد اور بے رحم شرافت، لگا لے جتنا زور لگا سکتی ہے ۔ میری روح کی چٹان سے ٹکرا کر آپ کے سارے ظلموں کا بُت پاش پاش ہو جائیگا لیجئے کھڑی ہوں آپ کے سامنے، آزمالیں اپنی طاقت ۔ ٹکرا لیں اپنا سر آپ

کی ہر ٹکّر آپ کے سر میں گہرا زخم کرے گی ؟"

پردھان اس مضبوط کردار اور آہنی قوت ارادی کے سامنے لڑکھڑا گیا۔ اس کی سب نفسانی خواہشات معدوم ہو گئیں۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ سارے خواب ہوا ہو گئے۔ اور سب جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ لیکن انتقام کے جذبے نے پھر گرمایا اور نیا جوش بھڑک اُٹھا۔

"واہ ری تیری پارسائی اور پاک دامنی! جیسے میں کچھ جانتا ہی نہیں۔ یہ تیرا لڑکا، ہیڈ ماسٹر کے ساتھ تیرے تعلقات، اور تیری دوسری کرتوتیں مجھ سے کیا چھپا ہے؟ ایسی با عصمت دیوی کا کچّا چِٹّھا اگر اخباروں میں نہ شائع کرا دیا تو مجھے مرد نہ کہنا"

"آپ جو چاہیں کریں، میں اُف تک نہیں کرونگی۔ کیا اب میں جا سکتی ہوں؟" پربھا نے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"لیکن جانے سے پہلے اپنی قسمت کا فیصلہ سُن لو۔ میں تمہیں ایسا بدنام کر دوں گا کہ کہیں کی نہ رہو گی۔ کوئی اسکول تو کیا کوئی شریف گھر بھی تم کو اندر گھُسنے کی اجازت نہیں دیگا۔ دَر دَر کی خاک چھاننے پر مجبور نہ کر دیا تو کہنا"

" پردھان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

پربھا جواب دئے بغیر وہاں سے چلی آئی اور پردھان کی ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے یا کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتے گذری۔ اس کی تمام تر روح انتقام کی آگ میں سُلگ رہی تھی۔

پر بھا کو اسکول سے نکال دیا گیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ اس کا بچّہ بد چلنی کا نتیجہ ہے۔ کئی اور باتیں بھی اس سے منسوب کی گئیں اور اخباروں میں بھی شائع کرا دی گئیں۔ یہاں تک کہ اپنے اسکول کی بدنامی کا بھی خیال نہ کیا گیا۔

ہیڈ ماسٹر بھی پربھا سے اظہارِ ہمدردی نہ کر سکا۔ کیونکہ اسے بھی بدنام کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ طالبات بھی اپنی محبوب اُستانی کے ساتھ اظہارِ عقیدت نہ کر سکیں۔ کیونکہ اب اس کا لمس بھی ناپاک سمجھا جاتا تھا۔

پربھا اپنے بچے کو لے کر امرتسر چلی گئی۔ ریل گاڑی میں اس کے ساتھ ایک معمر بیوہ بیٹھی تھی۔ راستہ بھر پربھا اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی رہی یہ بزرگ عورت امیر طبقہ کی تو نہیں تھی لیکن ایک ہمدرد دل رکھتی تھی۔ پربھا کے اس بھری جوانی میں بیوہ ہوجانے کے بارے میں سُن کر اُسے بہت رحم آیا۔ پربھا نے مختصر طور پر اُسے اپنی داستان سُنائی اور بتایا کہ اسکول سے اُس پر جھُوٹا الزام لگا کر نکالا گیا ہے۔ اُس نے ارادتاً پردھان کا ذکر نہ کیا اور کہا کہ اب اس کا ارادہ امرتسر پہنچ کر اور کسی غیر گنجان محلے میں مکان لے کر سلائی کا کام کرنے کا ہے۔ مشین خریدنے کے لئے اس کے پاس روپیہ تھا اور وہ اس ہُنر میں ماہر بھی تھی۔

اُس بزرگ عورت کی گذر بسر دو مکانوں کے کرایہ پر تھی۔ وہ پربھا کی تجویز سن کر خوش ہوگئی اور اس نے اسے اپنے پاس بطور کرایہ دار رکھنے کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ پربھا کو اپنی بیٹی سمجھے گی اور اسے دنیا کی تہمتوں سے بچائے گی۔ پربھا نے کرایہ ہر مہینے پیشگی دینے کا وعدہ کیا اور اس کے ساتھ چلی گئی۔

پربھا کا یہ پختہ یقین تھا کہ دُنیا کی کوئی مصیبت بھی ناقابل برداشت نہیں ہوتی۔ انسان کی رُوح میں مکمّل تاریکی کبھی نہیں آتی۔ اگر یکے بعد دیگرے سارے چراغ بجھ جائیں تو بھی کہیں نہ کہیں سے اچانک کوئی

روشنی نمودار ہو جاتی ہے ۔ زندگی کی چڑھائی میں جب ٹانگیں تھک کر چُور ہو جاتی ہیں اس وقت کسی درخت کے گھنے سائے میں پڑا ہوا کوئی پتھر نظر آ جاتا ہے جس پر بیٹھ کر تھکا ہوا مسافر گھڑی دو گھڑی کے لئے سُستا لیتا ہے ۔

پربھا اس معمر بیوہ کے گھر میں رہنے لگی ۔ اس نے مشین بھی خرید لی ۔ اور اس بزرگ عورت کے توسط سے دو چار گھروں میں اُس کی جان پہچان بھی ہو گئی ۔ اس کے بعد چراغ سے چراغ جلتا گیا اور بہت سے گھروں میں اس کا آنا جانا ہو گیا ۔ میٹھے بول اور خوش خلق انسان کو کہیں بھی کوئی کمی نہیں ہوتی ۔ یہاں بھی سگھڑ پربھا نے اپنے حُسنِ سلوک سے ہر دلعزیزی حاصل کر لی ۔ کئی پڑوسنوں کو سینا پرونا سکھا دیا ۔ کئی ایک کو پڑھانا شروع کر دیا ۔ محلّہ میں جان پڑ گئی ۔ چترنجن بھی اب توتلی باتیں کرنا سیکھ گیا تھا ۔ اُجڑے دل میں پھر سے بہار آ گئی ۔ پھُول کھل اُٹھے ۔

لیکن پھُولوں میں بھی ایک نقص ہوتا ہے ۔ جب یہ کھلتے ہیں تو دُور دُور تک دکھائی دیتے ہیں اور بعض لوگ صرف دیکھنے تک اکتفا نہیں کرتے جب تک وہ انہیں توڑ نہ لیں ، ان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی ۔

پربھا بہت خوش تھی ۔ اسے سب غم بھُول گئے ۔ جو قسمت چترنجن چھین کر واپس دے سکتی ہے ہسپتال چھین کر اسکول اور اسکول چھین کر

یہ محلہ اور اس محلہ کی عورتوں کی رفاقت اور ہمدردی دے سکتی ہے۔ اسے
اتنا سنگدل نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی ایسی قسمت کو کوسا جا سکتا ہے جو
ایک ہاتھ سے لیتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے دیتی ہے۔

لیکن کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ صاف شفّاف آسمان پر کہیں غیب
سے کوئی بادل کا ٹکڑا امنڈلاتا ہوا چلا آتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں
چاروں طرف پھیل کر سورج کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے۔

یہی خیال پربھا کو اس دن آیا۔ جس دن اس کو اپنی گلی کے موڑ پر
اس شخص کی سی صورت نظر آئی۔ جو اسے خواب میں بھی آ آ کر دھمکایا کرتا
تھا کہ "اگر تمہیں در در کی خاک چھاننے پر مجبور نہ کر دیا تو کہنا۔"

اُس دن سے پربھا سوچنے لگی کہ زندگی کی منزل کی چڑھائی ابھی اور
باقی ہے اور راستے کے اس مہربان درخت کا سایہ بھی چھوٹنے کو ہے۔
لیکن وہ اپنے چترنجن کے ساتھ دل بہلا لیتی اور اپنے کام کاج میں مشغول
رہتی۔

ایک دن پھر پربھا نے اپنی گلی میں اس شخص کے ملازم کو دیکھا۔
پہلے تو اس نے سوچا کہ وہ اس محلے کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلی جائے۔
[illegible] کوئی بہانہ بنا کر اُس بزرگ عورت سے جانے
کی اجازت لے گی جس نے اپنے دست میں اس کی خبر گیری کی تھی۔ جب

دنیا میں اس کا کوئی ہمدرد اور مددگار نہ تھا ۔ اور خصوصاً اب جب کہ وہ
چیتر بجن کو اپنے پوتے اور نواسے کی طرح عزیز سمجھتی تھی ۔ وہ اگرچہ غریب
تھی ان کی کوئی مالی امداد نہیں کر سکتی تھی لیکن محبّت تو دے سکتی تھی ۔
پیار تو کر سکتی تھی ۔ اور یہی سوچ کر پربھا نے وہاں سے جانے کا ارادہ
ترک کر دیا اور اپنی شدنی سے دو چار ہونے کے لئے اپنا دل مضبُوط
کر لیا ۔

شدنی نے بھی کچھ زیادہ انتظار نہ دکھایا ۔ ایک دن جب پربھا باہر
سے آئی تو دیکھا کہ اس کی مشین غائب ہے اور چھان بین کرنے سے یہ
بھی معلوم ہوا کہ دو تین دن پہلے بیاہ کے چند جوڑے سینے کے لئے جو
ریشمی کپڑے اسے دئے گئے تھے' وہ بھی نہیں ہیں ۔ مشین تو خیر اس کی
اپنی تھی لیکن ان کپڑوں کی قیمت اڑھائی تین سو روپے وہ کہاں سے دیگی؟
چوری ہو گئی ۔ کسی نے ہمدردی کی اور کسی نے اس پر شک کیا ۔ کسی
نے پولیس میں اطلاع دینے کا مشورہ دیا اور کسی نے آشناؤں کی تہمت
لگائی ۔ جو عورتیں اس کے پاس آکر پڑھنے اور سینے پرونے کا کام سکھا کرتی
تھیں ۔ ان میں سے کئی ایک یہ کہنے لگیں کہ اس کے پاس مرد آیا جایا کرتے
تھے ۔ صرف اس لئے کہ ان کے شوہروں نے باتوں ہی باتوں میں کئی بار پربھا
کی سُوجھ بُوجھ اور اس کی صورت و سیرت کی تعریف کی تھی ۔

بزرگ بیوہ سے جتنا بن پڑا - اس نے مدد دی - کچھ روپیہ پربھا نے بھی بچا رکھا تھا - کچھ اس بیوہ نے دیا اور باقی کے لئے پرونوٹ لکھ کر پربھا نے گم شدہ کپڑوں کی قیمت ادا کی - اب پربھا اس محلے میں نہیں رہ سکتی تھی - کیونکہ جب اس نے پولیس میں چوری کی اطلاع نہ دی - تو لوگوں نے فوراً یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ کپڑے ضرور اپنے کسی آشنا کو دے آئی ہے -

پربھا اپنے چتر بجن کو ساتھ لے کر وہاں سے چل دی - اس سے پہلے جب کبھی وہ کہیں سے نکلی تھی، اس کے پاس کچھ نہ کچھ اثاثہ ضرور ہوتا تھا - لیکن آج اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی - اپنے بچے کو گلے لگا کر وہ بیک بینی و دو گوش نکلی تھی -

اب جائے تو کہاں ؟ یہ سوچنے کے لئے اسے کہیں دو گھڑی بیٹھنے کی ضرورت تھی وہ خود تو خیر بھوکی رہ سکتی تھی - لیکن چتر بجن کو جب تھوڑی دیر بعد بھوک لگے گی تو وہ کیا کرے گی ؟

وہاں ہرمندر میں کوئی عمارت تعمیر ہو رہی تھی - اس بزرگ عورت کے ساتھ اس نے دربار صاحب میں جا کر کئی بار سیوا کی تھی - دربار صاحب میں لنگر بھی ہوتا ہے لیکن وہ لنگر سے مفت کھانا کھانے کو تیار نہیں تھی - ہاں کام کر کے کھانے میں کوئی حرج بھی نہ سمجھتی تھی - اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ دو چار دن وہاں کام کر کے پرکرماں (طواف کے راستے) میں سو رہا

کرے گی۔ اور اپنے مستقبل کے لئے کوئی تجویز سوچے گی۔

یہ تجویز بُری نہیں تھی۔ بے شمار مرد اور عورتیں تعمیر کے کام میں سیوا کرتے تھے۔ لنگر سے کھانا کھاتے تھے اور پرکرماں میں رات بسر کر لیتے تھے لیکن یہ فیصلہ کرتے ہوئے پربھا یہ بھول گئی کہ وہ ان بیشمار عورتوں جیسی نہیں تھی۔ خوبصورت تھی اور تنہا تھی۔

پربھا روڑی کی ٹوکریاں سر پر اٹھا کر بنیادوں میں ڈالتی رہی۔ ایک سیوادار (رضاکار) ٹوکریوں میں کدال سے روڑی بھر کر سر پر اٹھواتا تھا۔ ایک دو ٹوکریاں تو اس نے انسانوں کی طرح اٹھوائیں لیکن پھر اس کے ہاتھوں کی انگلیاں پھیل کر پربھا کے گالوں کو چھونے لگیں۔ پربھا نے روڑی اٹھانے کا کام چھوڑ دیا۔ اور اینٹیں اٹھا کر پہنچانے لگی۔ اینٹیں بھی زیرِ تعمیر عمارت کے نزدیک ہی پڑی تھیں۔

وہ کافی دیر تک یہ خدمت انجام دیتی رہی۔ اتنے میں چِترنجن رونے لگا۔ اس کو بہلا کر لنگر کی طرف لے گئی۔ ایک آدھ روٹی کھائی اور کچھ چترنجن کو کھلا کر ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی اور چترنجن کے ساتھ کھیلنے لگی۔

اس کا دل بہلاتی، اس کو ہنساتی اور پیار کرتی رہی۔ پھر جب وہ سو گیا تو اس کو اٹھا لائی اور جہاں پہلے کام کر رہی تھی۔ وہاں قریب ہی اسے لٹا کر پھر اینٹیں پہنچانے میں مصروف ہو گئی۔ کیونکہ اسے دو وقت کے کھانے کے

برابر ضرور کام کرنا تھا۔

روڑی کی ٹوکریاں اٹھوانے والے سیوادار نے اس پر برابر نظر رکھی۔ کیونکہ پربھا کی حرکات وسکنات سے ایک قسم کی بیچارگی ٹپکتی تھی۔ نیک دلوں میں تو اس قسم کی بیچارگی ہمدردی کے تار کو متحرک کرتی ہے لیکن بُرے دلوں میں موقعہ سے فائدہ اٹھانے کا لالچ پیدا کرتی ہے۔

وہ ایک پُرانا سیوادار تھا۔ وہ دو قسم کی عورتوں کو فوراً پہچان لیتا تھا۔ ایک جو بداخلاق ہوں اور دوسرے وہ جو بے سہارا ہوں اور جن کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہو۔

اس سیوادار نے بھی اپنا کام چھوڑ کر اینٹیں اٹھاکر پہنچانے کا کام شروع کر دیا۔ وہ پربھا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور مُنھ میں کچھ بڑبڑاتا بھی جاتا تھا۔ راستہ میں یہاں وہاں اینٹیں بکھری پڑی تھیں۔ اس لئے ذرا احتیاط سے چلنا پڑتا تھا۔ پربھا اپنی قسمت پر اتنے آنسو نہیں بہاتی تھی جتنا ان لوگوں کے اخلاق کو روتی تھی۔ غضب ہے۔ کوئی اسکول، کوئی آشرم، کوئی پردھان، کوئی مندر، کوئی سیوادار اور کوئی بھگت اس ہوس اور بداخلاقی سے مبرّا نہیں۔ چاروں طرف نفسانی خواہشات اور حیوانی حرکات ہی کا دَور دَورہ ہے۔ وہ کسے بتائے۔ کس کے آگے فریاد کرے۔ سارے جج اور سارے ثالث اس کی جوانی اور اس کی خوبصورتی

کو صرف ایک ہی زاویۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اُف! یہ سب لوگ وہ ہیں جن کی پارسائی نے اسے 'بن بیاہی ماں' کہہ کر برادری سے نکال دیا تھا اور اسے کسی کنواری یا شادی شدہ عورت کی صحبت کے ناقابل قرار دے دیا تھا۔

وہ یہ شکوے اپنے دل ہی دل میں کر رہی تھی، جب اسے اس بھونڈی شکل والے شیطان سیرت سیوا دار کی گستاخانہ حرکات پر غصّہ آگیا لیکن اسی غصّہ کی وجہ سے سر پر رکھی ہوئی اینٹوں کا توازن برقرار نہ رہا۔ آگے پڑی ہوئی ایک اینٹ سے ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل زمین پر جا گری دوسری اینٹ سے ماتھا پھٹ گیا۔ خون کا فوّارہ پھوٹ نکلا اور وہ بیہوش ہو گئی۔

لوگ باگ اکٹھے ہو گئے۔ چوٹ شدید تھی۔ کیس نازک سمجھا گیا۔ گوردوارہ کا ڈاکٹر تو حسب معمول غیر حاضر تھا۔ کمپونڈر نے رائے دی کہ اسے لال ڈاکٹر کے پاس پہنچا دیا جائے۔

لال ڈاکٹر کا اُس گرد و نواح میں بہت شہرہ تھا۔ اسے لال اس لئے کہتے تھے کیونکہ وہ مگتی سینا کا لال کوٹ پہنتا اور لال پگڑی باندھتا تھا۔ وہ ضعیف العمر تھا۔ کسی سے فیس نہیں لیتا تھا اور اپنے اعلےٰ اوصاف اور خصائل کی وجہ سے بہت ہر دلعزیز تھا۔

اس سیوا دار نے اتنی عقلمندی ضرور کی کہ جب پربھا کو چارپائی پر ڈال کر لال ڈاکٹر کے پاس لیجانے لگے تو وہ سوئے ہوئے چترنجن کو اُٹھا لایا۔

لال ڈاکٹر نے زخم کو دیکھا۔ مرہم پٹّی کی۔ لیکن پربھا کو ہوش نہ آیا۔ ڈاکٹر نے زخمی کی ہسٹری دریافت کی۔ یہ معلوم کر کے کہ اس کا کوئی رشتہ دار ساتھ نہیں تھا۔ اور نہ ہی کوئی اس کے بارے میں کچھ جانتا تھا' اس نے سب کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا۔ کہ وہ خود سارا انتظام کر لے گا۔ اور زخمی کو اپنے ہی گھر میں رکھے گا۔ اِس کا کہنا تھا کہ بہت زیادہ خون بہہ جانے سے کیس خطرے سے خالی نہیں اور ممکن ہے کسی اور سرجن کی ضرورت پڑ جائے۔ اس کا انتظام بھی وہ خود کر لے گا۔

لوگ چلے گئے' وہاں پربھا کا کوئی ہمدرد تو تھا نہیں' اگر تھوڑی بہت دلچسپی کسی کو تھی تو صرف اور صرف اس کے حسن و شباب سے۔ اور اب اُس شباب کا رنگ خون نکل جانے سے پیلا اور پھیکا پڑ گیا تھا۔ اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ماتھے کی چوٹ نہ جانے اس کے چہرے کو کس حد تک بگاڑ دے۔

لیکن جب ظاہرا اور باہری چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ تو کسی اندرونی اور باطنی نور کی روشنی چمک اُٹھتی ہے۔ یہ پربھا کا اعتقاد تھا۔

اب جبکہ رات کے اندھیرے میں اور بیہوشی کی حالت میں ایک کمرے میں پڑی ہوئی تھی - اور اس کے قریب ایک ہنگھوڑے میں اس کا چتر بجن سو رہا تھا - اس کے بجھے ہوئے چراغ پر ڈاکٹر لال کی آنکھوں کے رُوحانی نور کا پرتو پڑ رہا تھا -

وہ ضعیف روشن چہرہ، وہ مقدّس سفید ڈاڑھی اور بڑی بڑی رحم بھری آنکھیں اس کی نگرانی کر رہی تھیں اور اس کی حساس اُنگلیاں منٹ منٹ کے بعد پربھا کی نبض ٹٹولتی تھیں - اتنے میں چتر بجن نے کروٹ بدلی - ڈاکٹر لال اٹھا - بڑی شفقت سے اسے تھپتھپایا اور پھر چُپ چاپ اپنی جگہ پر آ بیٹھا -

ڈاکٹر لال، پربھا کی زندگی کے اس لمبے سفر میں ایک اور منزل ثابت ہوا۔ لبعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے طوفان صرف ہمارے قدموں کو ڈگمگانے اور ہمیں راستے سے بھٹکانے کے لئے ہی نہیں آتے بلکہ کئی بار ہمیں اڑا کر جلدی منزل مقصود پر پہنچانے کے لئے بھی آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی کاریگر زندگی کی چولوں کو ٹھوک ٹھاک کر صحیح سوراخوں میں فِٹ کرتا ہے۔ یہ ضربیں توڑنے کے لئے نہیں بلکہ درست جگہ پر پیوست کرنے کے لئے لگائی جاتی ہیں۔

پربھا، ڈاکٹر لال کے پاس پہنچ گئی۔ ایک جیسی دو روحوں کو

یکجا کرنے کے لئے ایک اینٹ کی ٹھوکر اور دوسری اینٹ کی چوٹ درکار تھی، جو پوری ہو گئی۔

ڈاکٹر لال نے بغیر شادی کرائے اپنی عمر کے ستّر سال خدمتِ خلق میں گذار دئے تھے۔ اور اب زندگی کی شام سر پر آپہنچی تھی۔ اس نے خدمت گذاری کی تمنّا تو جی بھر کر پوری کر لی تھی۔ لیکن کسی ساتھی کے لئے دل میں ابھی تک کسک محسوس ہوتی تھی۔ ڈاکٹر لال کو ہندوستان میں دُکھی لوگوں کا درد کھینچ لایا تھا۔ انگلستان میں اس کی کافی جائداد تھی۔ وہ مکتی سینا سے کسی طرح کا معاوضہ نہیں لیتا تھا بلکہ دواؤں کا سارا خرچ بھی خود ہی برداشت کرتا تھا۔ دس سال ہو چکے تھے اور اب کئی بار اس کے دِل میں خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ واپس انگلستان چلا جائے۔

لیکن پربھا اور چترنجن کی آمد سے اُن تینوں کو ایک نئی دُنیا اور نئی زندگی مل گئی۔ بوڑھے ہاتھ جوان ہاتھوں میں پکڑے ہوئے لال اور پربھا جب کمپنی باغ میں ٹہلنے کے لئے جاتے تھے۔ تو ان کی اندرونی جنت اس باغ کو باغِ ارم بنا دیتی تھی۔ گھر پر جب چترنجن، ڈاکٹر لال کے کندھوں پر اور کبھی چھاتی پر چڑھ کر کودتا تو ہنسی کے مارے دونوں کی آنتیں پھول جاتیں۔ پربھا زور زور سے تالیاں بجاتی اور نوکر تماشہ دیکھتے۔ اس وقت راہگیر حیران ہو کر مکان کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور سوچتے کہ ڈاکٹر

لال کو کیا ہو گیا ہے ؟

پربھا کو تو یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی ہے۔ اب چیتر بجن کی پرورش بھی اعلےٰ طریقہ سے ہو جائے گی اور خود اسے بھی اپنی تعلیم اور تربیت کو بنی نوع انسان کی خدمت میں لگانے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن لوگ اس کے برعکس سوچتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ پربھا کے ہونٹوں سے لگا ہوا پیالۂ حیات وہ اب بھی چھین سکتے ہیں۔ جسے وہ چھین کر رہیں گے۔

کوئی بات ایک کے منھ سے نکلی اور دوسرے کے کانوں میں پہنچ گئی۔ اور اس طرح سے رفتہ رفتہ پربھا اور ڈاکٹر لال کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلنی شروع ہو گئیں۔ کسی نے کہا کہ یہ ناممکن ہے اور کسی نے کہا کہ اس دُنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ عیسائی ڈاکٹر کو اس بات کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ ایک ہندو لڑکی کو اپنے گھر میں رکھے۔ اور کوئی کہتا تھا کہ اس نے خفیہ طور پر اسے عیسائی بنا لیا ہے۔ کسی نے شور مچایا کہ اُسے گائے کا گوشت کھلا کر اس کا دھرم بھرشٹ کر دیا ہے اور وہ مجبوراً عیسائی ہو گئی ہے۔ لیکن کسی بھی ذات شریف نے اس حقیقت کی طرف توجہ نہ دی کہ مکتی سینا والے تو کسی قسم کا گوشت استعمال نہیں کرتے۔ مگر وہاں حقیقت سے کسے مطلب تھا۔ وہاں تو صرف یہ مدعا تھا کہ ایک

ہندو لڑکی کو عیسائی کے چنگل سے نکالا جائے۔

ہندوؤں کے علاوہ سکھ بھی اس لڑکی کے دعویدار تھے کیونکہ جب وہ زخمی ہوئی تھی تو ہر مندر میں سیوا کر رہی تھی۔ چنانچہ خیالات کے اعتبار سے وہ سکھ تھی۔ اور چونکہ وہ گوردوارہ کی اینٹوں سے خون میں لت پت ہوئی تھی اس لئے اس پر سکھوں کا حق زیادہ تھا۔

عجیب واویلا ہونے لگا۔ کونسلوں میں سوال اٹھانے کا نوٹس دیا گیا —— اور پھر ہزاروں آدمیوں کے دستخطوں کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے پاس درخواست بھیج دی گئی۔

لیکن یہ پنچائتی معاملہ نہیں تھا۔ کوئی قومی اسکول، مندر یا گوردوارہ نہیں تھا۔ جہاں لوگوں کے شور و غوغا سے مرعوب ہو کر یا سچی جھوٹی گواہیوں پر اعتبار کر کے فیصلہ سُنا دیا جاتا۔ یہ ایک سمجھ دار افسر کی عدالت تھی۔ ڈپٹی کمشنر، ڈاکٹر لال کو اچھی طرح جانتا تھا۔ سارا شہر ڈاکٹر لال کی خدمات کا احسان مند تھا۔ پربھا کو عدالت میں طلب کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر اس کا پُرجلال چہرہ اور اس کی بے جھجک مُدبّرانہ گفتگو سُن کر دنگ رہ گیا۔ پربھا نے اپنی سرگذشت کا پہلا حصّہ نظر انداز کرتے ہوئے دہلی سے لے کر امرت سر تک کے تمام واقعات بلاکم و کاست بیان کر دئے اور کہا۔

"اس سماج کا میری آزادی پر کوئی حق نہیں ہے۔ اگر آپ کا انصاف

مجھے میرے محترم باپ ڈاکٹر لال کی پناہ سے نکال کر پھر مجھے میرے ان جانی دشمنوں کے حوالے کریگا تو میں زندہ رہنے سے انکار کر دوں گی۔ بس یہی میری برداشت کی حد ہے۔"

"کیا آپ نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے؟" ڈپٹی کمشنر نے اپنی فائل مکمل کرنے کی غرض سے پوچھا۔

"نہ کیا ہے نہ کروں گی اور نہ ہی کسی دوسرے مذہب کو اپنی زندگی نذر کر سکتی ہوں۔ اگر آپ زندہ رہنے دینگے تو اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہونگی۔ ورنہ میں پھر کہتی ہوں کہ مجھے زندہ رہنے سے انکار ہے"۔ پربھا کے عزم و استقلال سے اس کا دبلا، نازک اور لمبے قد والا جسم سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا۔

ڈپٹی کمشنر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈائس سے اتر کر پربھا کے پاس آیا اور بڑے احترام سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یقین دلاتے ہوئے بولا۔

"آپ ڈاکٹر لال کے پاس ہی رہیں گی۔ اگر جاہل لوگوں کے تعصب نے خوفناک فساد کی شکل اختیار کر لی تو بھی حکومت کی ساری طاقتیں آپ کی آزادی کی حفاظت کے لئے صرف کر دی جائینگی۔ آپ کے ساتھ ہوئی اس ملاقات کو میں اپنی عزت افزائی سمجھتا ہوں"۔ پھر پولیس کپتان

سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"اور آپ ان کو ڈاکٹر لال کے بنگلے پر پہنچا کر آئیں اور ان کی حفاظت کا مکمّل انتظام کر دیں۔"

۱۱

لوگوں نے ڈاکٹر لال کا بائیکاٹ کر دینے کا شور مچایا۔ لیکن وہ کسی سے فیس یا دوا کی قیمت تو لیتا نہیں تھا۔ اس لئے اس شور و شر کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ جن مریضوں کی خدمت کے لئے وہ اس ملک میں رہ رہا تھا، وہ اس کا بائیکاٹ کر ہی نہیں سکتے تھے بلکہ اب تو اس نے پربھا کے کہنے پر اپنی انگلستان کی ساری جائداد بیچ کر اس روپے سے یہاں ایک نرسنگ ہوم کھول دیا تھا جو دکھی عورتوں کے لئے جنت کا سا درجہ رکھتا تھا۔ پربھا نے سماج کے مظالم کی شکار عورتوں کو بھی اس ہوم میں پناہ دی اور ان کے لئے وسیع پیمانے پر ایک ٹیلرنگ شاپ کھول دی۔

وہاں ہر ایک مذہب اور قوم کی ضرورت مند عورتوں کو پناہ اور کام دیا جاتا تھا۔

چند دنوں میں ہی دُور و نزدیک چاروں طرف مشہور ہو گیا کہ پربھا کے ہاتھوں میں شفا ہے۔ اسے دُور دُور سے درخواستیں آنے لگیں۔ لیکن وہ بہت کم باہر جاتی تھی۔ کیونکہ ضرورت مند عورتیں اور مقامی مریض اسے باہر جانے کی مہلت ہی نہ دیتے تھے۔

ڈاکٹر لال کو دہرہ دون سے اپنے ایک دوست کی بیماری کا تار ملا۔ اس نے پربھا کو وہاں بھیج دیا۔ کیونکہ چیر تجن کے ساتھ اب اس کو اتنی محبّت ہو چکی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ پربھا کی محبّت پیتھی کے نتائج اس کی ایلوپیتھی کی نسبت بہتر نکل رہے ہیں۔

واپسی پر جب پربھا سہارنپور اسٹیشن پر گاڑی بدلنے لگی تو جس قُلی نے پربھا کا سامان اُٹھایا ہوا تھا، وہ کہیں غائب ہو گیا۔ پربھا نے قُلی کا نمبر نوٹ نہیں کیا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع ملی تو وہ افسوس ظاہر کرنے لگا۔ اگرچہ گاڑی کے آنے تک اس قُلی کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا۔ لیکن پھر اسٹیشن ماسٹر کو ایک بات یاد آ گئی۔

"آپ ویٹنگ روم میں آرام کریں۔ میں دیکھتا ہوں۔ میرے خیال

میں آپ کا سامان ضرور مل جائے گا"۔ یہ کہہ کر اسٹیشن ماسٹر ایک طرف چل دیا۔

جب پربھا ویٹنگ روم میں چلی گئی تو اسٹیشن ماسٹر نے سکھ راج نامی قلی کو بلاکر پربھا کے سامان کی بات بتائی۔

"میں اس حرکت پر بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن اگر ضرورت ہوئی۔ تو آپ دس منٹ کے لئے گاڑی روک لیں۔ میں اپنے سبھی قلیوں کو جمع کرکے سامان کا پتہ لگاتا ہوں"۔ سکھ راج نے کہا۔

اسٹیشن ماسٹر خوشی خوشی پربھا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ویٹنگ روم میں پہنچا اور کہنے لگا۔

"سکھ راج قلیوں کا لیڈر ہے۔ سب قلی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ اُس نے یہاں قلیوں کی ایک انجمن بنا رکھی ہے۔ ایک اسکول بھی چلا رہا ہے اور ایک کوآپریٹو سوسائٹی بھی بنا رکھی ہے۔ جس میں سب قلیوں کے کھاتے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ ضرور کوئی نیا قلی ہوگا جس نے ایسی افسوسناک حرکت کی ہے۔ خیر، سکھ راج نے سبھی قلیوں کو بلایا ہے اور اگر ضرورت ہوئی۔ تو گاڑی دس منٹ کے لئے روک لی جائیگی"۔

پربھا بہت خوش ہوئی۔ ایک تو اس لئے کہ اس کے بیگ میں اپنی گذشتہ محبت کی یادداشت چیتر نجن کی تصویر تھی۔ اور دوسرے وہ

سکھ راج ایسے قلی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ نیک اور خوبصورت دل والے لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا کرتی تھی۔

اسٹیشن ماسٹر چلا گیا لیکن دس منٹ کے بعد سکھ راج کے ساتھ پھر واپس آگیا۔ سکھ راج نے اپنے سر پر پربھا کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ پربھا کے دل میں سکھ راج کی قدر پہلے ہی گھر کر چکی تھی۔ جب اسٹیشن ماسٹر نے اس کا نام لیا تو پربھا نے اٹھ کے اور دونوں ہاتھ جوڑ کے اس کا استقبال کیا ——— سکھ راج نے سامان زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ہمارے قلی کو معاف کر دیں۔ یہ نیا آدمی تھا۔ مجھے بہت شرم محسوس ہو رہی ہے۔"

پربھا نے بٹوے میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا۔ لیکن جب سکھ راج کے چہرے پر نظر دوڑائی تو اسے انعام دینے کی جرأت نہ ہو سکی۔ جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔

"میں اُس قُلی کو معاف کر دینا چاہتی ہوں اور اس کی مزدوری بھی ابھی میرے ذمہ ہے۔"

"نہیں، محترمہ آپ جلدی کریں۔ آپ کی گاڑی تیار ہے" یہ کہہ کر سکھ راج نے جلدی سے سامان اُٹھا لیا۔ پربھا نے اسٹیشن ماسٹر کا شکریہ ادا کیا اور قلی کے پیچھے ہو لی۔

قلی نے جب پربھا کو گاڑی میں بٹھا دیا تو اس نے بہت سارے پیسے اُسے دینے چاہے - لیکن وہ صرف ایک آنہ لے کر اور نمستے کر کے چلا گیا۔ پربھا کے بیٹھتے ہی گارڈ نے گاڑی چلا دی - جب گاڑی حرکت میں آئی تو سکھ راج ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا - اور پھر پلیٹ کر جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا - پربھا بھی کھڑکی سے گردن باہر نکالے اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی - سوچتی ہو گی کیسا انوکھا قلی ہے - اس کی بات چیت کتنی شائستہ اور شیریں ہے اس کے الفاظ کتنے مختصر لیکن مُوثر ہیں -

پربھا کے دل میں اس قلی کی یاد بہت دنوں تک تازہ رہی - بارہا اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر سہارن پور جائے اور اس قلی کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرے - لیکن مریض اسے کہیں جانے کا وقت کہاں دیتے تھے - اس کے علاوہ کچھ دنوں سے پربھا کی شہرت سن کر ایک بُوڑھی عورت اور اس کا شوہر بہت دُور سے علاج کے لئے آئے ہوئے تھے - عورت کو اس عمر میں بھی غشی کا دَورہ پڑ جاتا تھا - شوہر بہت امیر تھا - اور بہت علاج کرا چکا تھا - پربھا نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا لیکن وہ اسے نہیں پہچان سکے تھے - پربھا کی حادثوں بھری زندگی نے اس کے چہرے کے کئی نقوش بدل دئے تھے - اور پیشانی کے لمبے زخم کے نشان نے تو اُس کا حلیہ ہی بدل دیا تھا -

پربھا نے عورت سے اس کی بیماری کا سارا حال دریافت کیا۔

"بیٹی کیا بتاؤں؟ کوئی بیماری نہیں، کوئی ظاہرا روگ نہیں" عورت نے جواب دیا۔ "یونہی بیٹھے بیٹھے غش آجاتا ہے۔ اب تین سال سے اس کا دورہ کچھ زیادہ ہونے لگا ہے۔ علاج کی مجھے تو زیادہ ضرورت نہیں لیکن راؤ صاحب اب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ علاج کی غرض سے جگہ جگہ لئے پھرتے ہیں۔"

"ان کے سوا مس صاحبہ! میرا اس دُنیا میں اور ہے بھی کوئی نہیں۔ آپ جتنی توجہ سے دیکھ سکتی ہیں انہیں دیکھیں۔ اگر یہ ٹھیک ہو گئیں تو میں اپنی ساری جائداد آپ کے نرسنگ ہوم کو دے دُوں گا۔" راؤ صاحب نے کہا۔

"آپ مجھے ان کی بیماری کا مکمل اور مفصّل حال بتائیے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ ضرور ٹھیک ہو جائیں گی۔" پربھا نے جواب میں کہا۔

"کیا بتاؤں؟ مس صاحبہ!" کہتے ہوئے راؤ صاحب کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ "پہلے میں ان کی طرف بہت کم توجہ دیتا تھا۔ اپنا سارا وقت سرکاری کاموں اور کلبوں میں گذار دیتا تھا۔ بیس سال تک ہمارے گھر میں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ایک بار ہمارے پڑوس میں ایک انگریز میاں بیوی آکر رہے۔ اس انگریز خاتون کے ساتھ انھیں بہت محبّت ہو گئی۔ آپ

ڈاکٹر ہیں، آپ سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیئے ......"

"بالکل ٹھیک - بلکہ میرا تو علاج ہی دِل کی اندرونی حالتوں سے واقف ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے - آپ بلا جھجک سارے حالات سے مجھے آگاہ کر دیں - اس وقت میں عورت نہیں ہوں، ڈاکٹر ہوں۔"

"ایک دن یہ اس میم کے گھر سے بہت جوش کی حالت میں واپس آئیں اتفاق سے اس وقت میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا - میں نے ان کے چہرے کی سُرخی کے بارے میں پُوچھا تو یہ ہنس کر میرے گلے سے چمٹ گئیں - میں نے پھر پُوچھا تو انھوں نے بتایا کہ آج اس میم نے میرا مُنھ اس ڈھنگ سے چُوما ہے کہ میرے ہونٹ پگھل گئے ہیں اور اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ آج تک ہمارے یہاں اولاد کیوں نہیں ہوئی - آپ کو کبھی اس میم کی طرح مجھے پیار کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی - اس دن کے ٹھیک دس مہینے بعد ہمارے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی - ان دنوں انھیں کبھی غشی کا دَورہ نہیں پڑا تھا - کئی سال تک اس لڑکی کے ساتھ ان کا دل بہلا رہا اور انھیں بیماری سے بھی نجات مل گئی - میری ترقی ہوتی گئی - مجھے خطاب ملتے رہے اور میں کام میں اس قدر مصروف رہنے لگا کہ ان کی زندگی میں میرا کوئی بھی حصّہ نظر نہ آتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں پھر سے بیماری کے دَورے پڑنے لگے - لیکن جُوں جُوں ہماری بچّی بڑی ہوتی گئی، ان کا تنہائی کا

احساس کم ہوتا گیا اور ان کی صحت بہتر ہو گئی۔ لیکن افسوس جب وہ لڑکی بی اے میں پڑھ رہی تھی تو دریا میں ڈوب کر مر گئی۔ اسے مگرمچھ نگل گیا۔ اس دن کے بعد سے ان کا یہ حال ہے کہ ...."

راؤ صاحب ابھی یہیں تک کہہ پائے تھے کہ ان کی بیوی کو غش آ گیا۔ پربھا نے راؤ صاحب کو باہر بھیج دیا اور جب مریضہ کو تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو پربھا نے مناسب دَوا پلا کر اسے آرام کرسی پر لٹا دیا۔ اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ پیار کیا۔ ہتھیلیوں کو سہلایا۔ کبھی اس کی مٹھیوں کو بند کیا اور کبھی کھول دیا۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں مُسکرا کر جھانکتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کے مرض کی نبض پہچان لی ہے اور اب میں اطمینان سے آپ کا علاج کر سکوں گی۔ آپ کا علاج اگرچہ کافی مشکل ہے۔ لیکن میں ضرور کروں گی۔ اور آپ ضرور ٹھیک ہو جائیں گی۔"

مریضہ کو کافی آرام محسوس ہو رہا تھا لیکن اس نے کہا "بیٹی میرا علاج مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔"

"میں سب جانتی ہوں۔ آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کی بیماری 'پربھا کی موت' ہے اور چونکہ وہ زندہ نہیں ہو سکتی اس لئے آپ اچھی نہیں ہو سکتیں۔"

پربھا کا نام سنتے ہی مرلیفنہ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔
"آپ میری بچّی کا نام کیسے جانتی ہیں؟ ہم نے تو ایک بار بھی اس
کا نام نہیں لیا۔"
"لیکن پربھا کو تو اپنا نام بتائے بغیر ہی معلوم ہو سکتا ہے" یہ کہتی
ہوئی پربھا اپنی ماں کے گلے سے چمٹ گئی۔ مادرانہ شفقت نے آغوش
کھول دی۔ ممتا کی آنکھوں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو پہچان لیا۔ اسے
اپنے اندر سما لیا۔ ماں بیٹی میں اور بیٹی ماں میں جذب ہو گئی۔

۱۲

کئی مہینے اور نکل گئے - پربھا کے والدین اور ڈاکٹر لال کا دل چترنجن کے کھیلوں سے کبھی نہ بھرتا تھا - وہ چاروں سارا سارا دن باغیچہ میں کھیلتے رہتے ــــــ کبھی گھوڑا سواری - کبھی چھپنا اور ڈھونڈنا کبھی آنکھ مچولی اور کبھی کوئی اور کھیل -

پربھا کی مصروفیات بڑھ جانے سے اس کی فرصت کے اوقات کم ہوتے گئے - اس کی ٹیلرنگ شاپ میں کئی عورتیں داخل ہو گئیں - اس کے نرسنگ ہوم میں لاتعداد مریض آتے اور صحت یاب ہو کر دعائیں دیتے ہوئے چلے جاتے - اب وہ مریضوں کو دیکھنے باہر بھی جایا کرتی تھی - ایک

دن ایک مریض نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے اسے سلائی کی وہ مشین دکھائی جو کبھی اس کے گھر سے کسی نے چرائی تھی۔ اس مریض نے اپنی حرکت پر پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے پربھا سے معافی مانگی اور پربھا نے بڑی فراخ دلی سے اسے معاف کر دیا۔

اس عدیم الفرصتی کے باوجود اسے سہارن پور والے قلی کی یاد آجایا کرتی تھی۔ آخر ایک برس بعد کسی طرح وقت نکال کر وہ سہارن پور جا پہنچی لیکن سکھراج وہاں نہیں تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ وہ کئی برس سے وہاں قلی گیری کا کام کرتا رہا تھا اور اپنی رہنمائی میں اس نے قلیوں کی ایک سوسائٹی بھی قائم کی ہوئی تھی۔

اس سوسائٹی میں وہ سب دو دو آنے روپیہ جمع کراتے تھے۔ اور یوں ایک مہینے میں چار سو روپے جمع ہو جاتے تھے۔ اب ان کے پاس کئی ہزار روپے جمع ہو گئے ہیں اور یہاں سے کچھ فاصلے پر انھوں نے کھیتی باڑی کا ایک کوآپریٹو فارم کھول لیا ہے۔ سکھراج ان کا صدر ہے اور وہ فارم بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔ پندرہ بیس قلی وہ یہاں سے اپنے ساتھ لے گیا ہے اور یہاں کے کئی دوسرے قلی بھی اس فارم کے ممبر ہیں۔ اسی طرح روپیہ اکٹھا کرتے ہیں اور باری باری سے فارم پر کام کے لئے جاتے ہیں۔

پربھا یہ سوچ کر واپس لوٹ آئی کہ پھر کبھی دقت نکال کر دہ اس فارم کو دیکھنے جائے گی۔ اس نے اسٹیشن ماسٹر کو جب اپنا پتہ دیا تو وہ یہ جان کر بے حد خوش ہوا کہ یہ وہی امرت سر کی مشہور و معروف دل کا مطالعہ کر کے علاج کرنے والی ڈاکٹر اور ہندوستان کی فلارنیس نائٹ انگیل تھی۔

پربھا کو واپس امرت سر پہنچے ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا ہو گا کہ اسے سہارن پور کے اسٹیشن ماسٹر کا تار ملا۔ مضمون تھا:-

"سکھ راج گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہو گیا ہے۔ اگر آپ آ سکیں تو........"

سکھ راج کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ سر پر بھی کاری چوٹیں لگی تھیں۔ ڈاکٹر کو وہاں بلانا لاحاصل تھا۔ اس لئے لاری میں لٹا کر اسے سہارنپور بڑے ہسپتال لے جایا گیا۔ اس کے ساتھی اس پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتے تھے۔ ایک اسپیشل وارڈ میں کمرہ لیا گیا۔ ہسپتال کی تمام تر لالچی فوج میں روپیہ تقسیم کیا گیا جس کی وجہ سے اب پورا عملہ زر خرید غلاموں کی طرح سکھ راج کے آگے پیچھے پھرتا تھا۔ مہتر سے لے کر بڑے ڈاکٹر تک سب کے سب پوری تندہی سے اس کی طرف متوجہ تھے۔

اب ضرورت تھی تو صرف ایک اچھی نرس کی۔ انھوں نے اسٹیشن ماسٹر سے مشورہ کیا کہ لاہور سے کوئی نرس منگائی جائے۔ جس پر اسٹیشن ماسٹر کو مسز پربھا

کا خیال آگیا اور یہ بھی یاد آگیا کہ اس کے ہمدرد دل میں سکھ راج کے کاموں اور اس کی شخصیت کی بہت قدر تھی۔ اس کے ہاتھوں میں شفا بھی بتائی جاتی تھی۔ چنانچہ اسٹیشن ماسٹر نے مسز پربھا کو تار دے دیا۔

ان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ دوسری صبح پہلی گاڑی سے ہی پربھا سہارن پور پہنچ گئی اور اسٹیشن ماسٹر اسے فوراً ہسپتال لے گیا۔ ڈاکٹروں سے ملاقات ہوئی۔ پربھا کی شہرت پہلے سے ہی اخبارات اور لوگوں کی زبانی ان تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس لئے انھوں نے بغیر کسی پس و پیش کے مریض کی نرسنگ کا چارج پربھا کے سپرد کر دیا۔

جو چیز وہاں ہر کسی کے دل پر اثر انداز ہوتی تھی۔ وہ تھی سکھ راج کے ساتھیوں کی سکھ راج سے بے پناہ محبت، ہمدردی اور اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی تمنّا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں سے کئی ایک تو اپنے اس مہربان اور دوست صدر کو اپنی جان تک دے کر بچا لینے کو بیتاب تھے پربھا بھی جُوں جُوں سکھ راج کے حالات سنتی تھی وہ اس کی اور زیادہ مدّاح ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بھی اُسے بچا لینے کے لئے اپنی جان تک دے دینے کو کوئی بڑی قربانی نہ سمجھتی تھی۔

سب لوگ یہی کہتے تھے کہ سکھ راج کو جو صحت اور تندرستی حاصل ہوئی ہے، وہ دوائیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ نرسنگ کا کرشمہ ہے۔ سچ پُوچھا جائے تو

سکھ راج کو ضرورت ہی نرسنگ کی تھی اور پھر قدرت نے، پربھا کی انگلیوں کو اس درجہ حساس بنایا تھا کہ زخموں سے چھلنی جسم بھی اس کے ہاتھوں سے دُکھ نہیں سکتا تھا۔ جہاں اس کے شفیق ہاتھ مس کر جاتے تھے زخمی کا سارا درد کھینچ کر اپنے اندر جذب کر لیتے تھے اور مریض کو یک گونہ راحت مل جاتی تھی۔

دس دن کے بعد یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اب سکھ راج خطرہ سے باہر ہے فارم پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ اسٹیشن پر قلیوں نے غریب مسافروں کا سامان بلا اُجرت اُٹھایا اور ایک دوسرے کو بڑھ چڑھ کر مبارکبادیں دیں۔

لیکن سکھ راج خوش نہیں تھا۔ ایک تو اس لئے کہ پربھا اُسی دن دو دنوں کے لئے واپس امرتسر چلی گئی وہ ایک ساتھ اتنا عرصہ باہر نہیں رہ سکتی تھی اور اس کے کئی کام اور اس کے بے شمار مریض اس کی توجہ کے محتاج تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اب سکھ راج کا دل اس طرح مطمئن اور پُرسکون نہیں تھا جس طرح پچھلے چار برس میں رہا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کسی کی پیاری پیاری یادیں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ جس کے سہارے وہ کسی بھی عورت کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور اس کی شیریں یادیں مست اپنے ساتھیوں کے آرام کی دُھن میں بڑی آسانی سے وقت گذار رہا تھا۔

لیکن اس نرس نے سکھ راج کے سکون قلب کو کچھ متزلزل کر دیا تھا۔ انسانی دل کبھی یکساں طور پر مضبوط نہیں رہ سکتا۔ سکھ راج کے دل کے قلعہ میں اس نرس نے کئی سوراخ کر دئے تھے۔ ہاتھوں میں ہاتھ دبا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور اس کی ہر خواہش کو مسکراتے ہوئے پورا کر کے دس دن میں ہی اس نرس نے سکھ راج کے دل کے مندر کے برس ہا برس کے معبود بُت کی جگہ ہلا دی۔

سکھ راج اس لئے بھی ناخوش تھا کہ وہ وفادار رہنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی پہلی محبّت کو نبھانا چاہتا تھا۔ اسے کسی اور کی خواہش نہیں تھی۔ لیکن نا معلوم اس انسانی قالب میں ایک ہی ہستی آباد ہے یا بہت ساری ایک ہی انسان دو خواہشات یا دو ارادے کیونکر رکھ سکتا ہے۔ سکھ راج چاہتا تھا کہ کوئی غیبی ہاتھ ایسا کر دے کہ اس نرس سے متعلق جو خدمات اور احساسات ہیں اور اس کے دل میں پیدا ہو رہے تھے" وہ نہ رہیں اور وہ اس بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار نہ کرے جیسے کہ وہ کر رہا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اگر وہ خود ہی کر رہا ہے تو اس کو ترک کیوں نہیں کر دیتا لیکن یہ کوئی آسان سوال نہیں ہے اس سوال کو حل کرنے کے لئے ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ پھر بھی اس اندرونی کشمکش کا مداوا کوئی نہیں ڈھونڈ سکا۔

"لیکن کہتے ہیں یہ نرس فٹ۔ غش۔ ہسٹیریا وغیرہ ٹھیک کر دیتی ہے
ضدی اور شریر بچوں کو راہ راست پر لے آتی ہے۔ اب واپس آئے گی۔ تو
میں بھی اسے اپنے دل کا حال بتاؤں گا۔ اسی سے کہوں گا کہ کسی طرح
میرے دل سے نکل جائے۔ میں اپنی .... اپنی .... کے سوا
اپنے دل میں اور کسی کو جگہ نہیں دینا چاہتا۔"

سکھ راج دن رات اسی قسم کے خیالات میں مستغرق رہتا تھا۔ اس
کے ساتھی حیران تھے کہ اس سے پہلے تو وہ کبھی اس طرح گم سم نہیں ہوا تھا
جب کبھی کوئی اس کے کمرے میں جاتا تھا تو وہ سب طرف سے خیال ہٹا
کر پورے طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن اب یہ حالت
تھی کہ جو آدمی اس سے ملنے کے لئے آتے تھے انہیں وہ کچھ دیر لجا سا ہی
بھول جاتا تھا۔

پربھا واپس آگئی۔ سکھ راج کے چہرے پر کچھ اور ہی رنگ نظر آنے
لگے۔ اس فرق کو ہر کسی نے دیکھا۔ ہر کسی نے محسوس کیا۔

شام کے وقت جب سب ملاقاتی چلے جاتے تو سکھ راج 'پربھا
سے درخواست کیا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ دبائے۔ کیونکہ ایسا کرنے
سے اُسے بہت راحت ملتی تھی۔ آج جب پربھا اس کے ہاتھ دبا رہی
تھی تو سکھ راج نے کہا ——

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس ہسپتال کی نرس نہیں ہیں بلکہ پنجاب سے تشریف لائی ہیں اور آپ کو انسانی دل کے بارے میں بڑی معلومات حاصل ہیں۔

"ہاں کچھ تو ہے"۔ پربھا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھر بتایئے آپ کے ہاتھ دبانے سے مجھے اتنی راحت اور مسرّت کیوں ملتی ہے؟" سکھ راج نے پوچھا۔

"کیونکہ میں اپنی راحت ان انگلیوں کے ذریعے آپ تک پہنچاتی ہوں اور میری خواہشات آپ کے اندر جا کر مسرت پیدا کرتی ہیں"۔ پربھا نے جواب دیا۔

"میں آپ سے محبّت کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن آپ کے لئے میرے دل میں والہانہ محبّت کے جذبات اُمڈتے رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟" سکھ راج نے سوال کیا۔

"اس کا جواب بھی میں دے سکتی ہوں۔ لیکن اس کے لئے مجھے آپ کے دل کی ہسٹری جاننی ہوگی"۔ پربھا نے کہا۔

اگر آپ میرا علاج کر سکتی ہوں۔ مجھے اس تذبذب سے نجات دلا سکتی ہوں تو میں یہ ہسٹری بھی بتا سکتا ہوں۔ لیکن میری ہسٹری بڑی پُراسرار ہے اور میری زندگی کا دارومدار ہی ان بھیدوں پر ہے۔ آپ ڈاکٹر ہیں۔

آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ میرے رازوں کو مقدس امانت سمجھیں گی"۔

"یہ وعدہ مریض اور ڈاکٹر کے درمیان ایک مستقل معاہدہ ہے۔ اس کے علاوہ کسی خاص وعدے کی ضرورت نہیں ـــ اگر آپ کو مجھ پر بھروسہ اور اعتماد ہے تو میں سننے کے لئے تیار ہوں"۔ پربھا نے سکھ راج کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبلتے ہوئے کہا۔

پربھا کا ایسا کرنا تھا کہ سکھ راج کے جسم میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گویا بجلی کی رَو دوڑ گئی۔ سکھ راج کی روح چمک اٹھی۔ پربھا کے چہرے پر اس چمک کا عکس تھا۔

"آہ میری میٹھی نرس! اگر آپ اجازت دیں تو میں ان ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لگاؤں؟" سکھ راج نے پُوچھا۔

"جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن اس قسم کی ہر حرکت آپ کے علاج کو اور زیادہ مشکل اور پیچیدہ بنا دے گی۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ مجھ سے محبّت نہ کریں اور اس کے لئے آپ میری مدد چاہتے ہیں .... لیکن ...."

"لیکن مجھے ایک بار اپنے یہ پیارے پیارے ہاتھ چُوم لینے دیں"۔ سکھ راج نے بات کاٹتے ہوئے اور پربھا کے ہاتھ چُومتے ہوئے کہا ـــ

"جہاں آپ اپنا پُورا وجُود میرے اندر سے نکالیں گی وہاں ان معصُوم

ہاتھوں کو بھی میرے ہونٹوں سے کھینچ کر الگ کر لینے لگا۔"
سکھ راج اور پربھا دونوں کے مُنہ سے بے اختیار ہنسی نکل گئی۔
پربھا نے مریض کو اپنے دل کی ہسٹری سُنانے کے لئے کہا تاکہ جلد از جلد اس کا علاج کیا جا سکے۔
"نرسی! میرا دل بالکل پرسکون رہا ہے۔ اس سے پہلے صرف ایک بار یہ متزلزل ہوا تھا جب میں نے ایک نیک خاتون کا کھویا ہوا سامان تلاش کر کے دیا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ میں عورتوں کی طرف بہت کم دیکھتا ہوں۔ میرے دل میں ایک عورت ہے جس نے ہر لحاظ سے میرے دل پر قبضہ کر رکھا ہے۔ لیکن اب آپ بیچ میں آگئی ہیں اور میرا سارا سکون جاتا رہا ہے۔" اب سکھ راج نے چاروں ہاتھوں کو اسی طرح اکٹھا کر دیا جس طرح تھوڑی دیر پہلے پربھا نے کیا تھا۔
"آپ جتنی جلد اپنا حال بیان کر دینگے اتنی ہی جلد میں آپ کا علاج کر سکوں گی۔" پربھا نے سکھ راج کے ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔
"کیا علاج کرینگی آپ؟"
"آپ کے دل سے اس نرسی کو نکال دُونگی۔"
"نہیں نہیں۔ کہیں سچ مچ ایسا نہ کر دیں......" سکھ راج

نے بھر پربھا کے ہاتھ پکڑ لئے۔

"میرا خیال ہے آپ یہی چاہتے تھے"۔

"آپ سمجھی نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میرے دل سے یہ تذبذب دور کر دیں"۔

"آپ نے اپنی بات بدل لی ہے خیر، آپ اپنی ہسٹری سنائیں"۔

"میں زیادہ تفصیل سے نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ بڑی درد بھری ہے۔ اور اسے دُہرانے سے مجھے تکلیف ہوگی۔ اس کے علاوہ اس سے پہلے آج تک یہ ہسٹری میری زبان پر نہیں آئی۔ سُنئے نرسی جی! ——— میں پھانسی کا مال ہوں۔ یہاں وہاں چھپتا پھرتا ہوں۔ سرکاری رجسٹروں میں مُردہ ہوں۔ لیکن جسے مرنا چاہیئے تھا وہ تو مرا نہیں اور جسے زندہ رہنا چاہیئے تھا، وہ مرگئی۔ آہ! میں مظفر پور جیل میں قید تھا، جب زلزلہ آیا۔ سب کے سب قیدی دب گئے۔ کئی ایک نکل آئے اور انھوں نے دوسروں کو ملبے کے نیچے سے نکالا۔ کسی سے ملاپ کا لالچ مجھے وہاں سے بھگا لایا۔ ہم نے مُردہ قیدیوں کے نمبر اُتار کر اپنے نمبر ان کے گلے میں ڈال دئے۔ میں یہاں آکر بھرتی ہوگیا اور پھر چند ماہ کے بعد مظفر پور گیا اُس پربھا کو دیکھنے کے لئے، جس نے میری ایک رات کو پُرمسرت بنانے کے لئے اپنی ساری زندگی کو رات میں بدل دیا تھا۔

اس نے دیدہ و دانستہ مرت کے لقمے سے بیاہ برت لے لیا تھا......
لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ دریا میں ڈوب کر مر گئی تھی۔ میں بھی چاہتا
تھا کہ اسی دریا میں کود کر جان دے دوں۔ لیکن یہاں میں ان سادہ
دل قلیوں کی ایک یونین بنا گیا تھا۔ ان کی خاطر واپس آ گیا۔ میں آج
تک پربھا کا وفادار رہوں۔ اس کے سوا کوئی میرے دل میں نہ کیا
آنکھوں تک نہیں آ سکا۔ ہاں سوائے اس ایک عورت کے جس کا سامان
گم ہو گیا تھا اور جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہے۔ اب میری غلطی کا تدارک
کیجئے"۔ سکھ راج نے بت بنی ہوئی پربھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ نے تو شائد میری کہانی سُنی ہی نہیں؟" اور اس نے پربھا کے
ہاتھ پھر پکڑ لئے۔
"نہیں! پوری توجہ سے سنی ہے۔ لیکن میں علاج سوچ رہی ہوں"
پربھا نے اس انداز سے کہا۔ جیسے کوئی شخص ایکا ایک اپنا ارادہ مضبوط
کر لیتا ہے۔
"جلدی سوچیں نرسی جی! جلدی سوچیں"۔
پربھا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے بیگ میں سے ریلوے کا ٹائم ٹیبل
نکالا اور دیکھ کر کہنے لگی۔
"میں نے سوچ لیا ہے۔ آپ مجھے ایک دن اور دو راتوں کی مہلت

نے پھر پربھا کے ہاتھ پکڑ لئے۔

"میرا خیال ہے آپ یہی چاہتے تھے"۔

"آپ سمجھی نہیں۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میرے دل سے یہ تذبذب دور کر دیں"۔

"آپ نے اپنی بات بدل لی ہے خیر، آپ اپنی ہسٹری سنائیں"۔

"میں زیادہ تفصیل سے نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ بڑی درد بھری ہے۔ اور اسے دہرانے سے مجھے تکلیف ہوگی۔ اس کے علاوہ اس سے پہلے آج تک یہ ہسٹری میری زبان پر نہیں آئی۔ سُنئے نرسی جی! ——

میں پھانسی کا مال ہوں۔ یہاں وہاں چھپتا پھرتا ہوں۔ سرکاری رجسٹروں میں مُردہ ہوں۔ لیکن جسے مرنا چاہیئے تھا وہ تو مرا نہیں اور جسے زندہ رہنا چاہیئے تھا، وہ مر گئی۔ آہ! میں مظفر پور جیل میں قید تھا، جب زلزلہ آیا۔ سب کے سب قیدی دب گئے۔ کئی ایک نکل آئے اور انھوں نے دوسروں کو ملبے کے نیچے سے نکالا۔ کسی سے ملاپ کا لالچ مجھے وہاں سے بھگا لایا۔ ہم نے مُردہ قیدیوں کے نمبر اُتار کر اپنے نمبر ان کے گلے میں ڈال دئے۔ میں یہاں آکر بھرتی ہو گیا اور پھر چند ماہ کے بعد مظفر پور گیا اُس پربھا کو دیکھنے کے لئے، جس نے میری ایک رات کو پُرمسرت بنانے کے لئے اپنی ساری زندگی کو اندھیرے میں بدل دیا تھا۔

اس نے دیدہ و دانستہ مرت کے لقمے سے بیاہ برت لے لیا تھا ......
لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ دریا میں ڈوب کر مر گئی تھی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ اسی دریا میں کود کر جان دے دوں۔ لیکن یہاں میں ان سادہ دل قلبیوں کی ایک یونین بنا گیا تھا۔ ان کی خاطر واپس آ گیا۔ میں آج تک پربھا کا وفادار رہوں۔ اس کے سوا کوئی میرے دل میں تو کیا آنکھوں تک نہیں آسکا۔ ہاں سوائے اس ایک عورت کے جس کا سامان گم ہو گیا تھا اور جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہے۔ اب میری غلطی کا تدارک کیجئے"۔ سکھ راج نے بُت بنی ہوئی پربھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"آپ نے تو شائد میری کہانی سُنی ہی نہیں؟" اور اس نے پربھا کے ہاتھ پھر پکڑ لئے۔
"نہیں! پوری توجہ سے سنی ہے۔ لیکن میں علاج سوچ رہی ہوں"
پربھا نے اس انداز سے کہا۔ جیسے کوئی شخص ایکا ایک اپنا ارادہ مضبوط کر لیتا ہے۔
"جلدی سوچیں نرسی جی! جلدی سوچیں"۔
پربھا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے بیگ میں سے ریلوے کا ٹائم ٹیبل، نکالا اور دیکھ کر کہنے لگی۔
"میں نے سوچ لیا ہے۔ آپ مجھے ایک دن اور دو راتوں کی مہلت

دیجئے۔ گاڑی کا وقت قریب ہے۔ میں پرسوں صبح آپ کے پاس پہنچ جاؤنگی اور یقین دلاتی ہوں کہ آتے ہی آپ کو نوبہ نو کر دوں گی" پربھا نے اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ مجھے ٹال رہی ہیں۔ یا سچ مچ نوبہ نو کر دیں گی؟"

"میں سب ٹھیک کر دونگی۔ صرف ایک دن اور دو راتوں کی مہلت چاہتی ہوں"

"کیا آپ علاج کرنے کے بعد نہیں جا سکتیں؟"

"علاج مکمل نہیں ہوگا۔ وقت کم ہے، جانے دیجئے"

سکھ راج کی حیل و حجت کے باوجود اس کا ہاتھ دباکر اور اپنی میٹھی مسکراہٹ سے نیک تمناؤں کا اظہار کرکے پربھا وہاں سے رخصت ہو گئی۔

سکھ راج کو اس بات کا تو یقین تھا کہ نرسی ٹالنے والی ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنے مریض کو آدھے راستہ میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی اور نہ ہی وہ اس بات سے ناراض ہو سکتی ہے کہ وہ اس کو اپنے دل میں نہیں رکھنا چاہتا۔ کیونکہ یہ تو وہ دیکھ ہی رہی تھی کہ وہ اس کے رویئں رویئں میں سمائی جا رہی ہے۔

"نہیں! نہیں میری نرسی ضرور آئے گی۔ مجھے ضرور نوبہ نو کرے گی"

اور یہی سب سوچتے ہوئے سکھ راج کو نیند آگئی - اس نیند میں اس نے بڑے میٹھے سپنے دیکھے -

دوسرا دن ان سپنوں کا لطف لینے میں نکل گیا اور وہ شام ہوتے ہی اسی طرح کے مزید سپنوں کی خواہش سے جلدی سو گیا -

صبح سویرے سکھ راج نے منہ ہاتھ دھو دیا - کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ کر دروازے کی طرف ٹکٹکی لگا دی - گھڑی اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ سوچ رہا تھا "گاڑی آگئی ہوگی" آدھ گھنٹہ اوپر ہو گیا ہے' اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ دروازہ کھلا اور پربھا اندر داخل ہوئی - اس کے ساتھ ایک بچہ تھا جو اجنبی جگہ دیکھ کر کچھ سہم گیا تھا -

پربھا نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور سکھ راج کے قریب کرسی پر آ بیٹھی - دونوں کی آنکھوں نے ایک دوسرے کا استقبال کیا -

" یہ آپ کا بچہ ہے ؟" سکھ راج نے بچے کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا -

" جی ہاں ! میں اسی کو لانے گئی تھی ... یہی آپ کے علاج کو مکمل کر سکتا تھا" پربھا نے جواب دیا -

" وہ کیسے ؟ بھلا یہ میرا علاج کیسے کرے گا ...... بلکہ اب تو آپ دو ہو گئے .... میں دونوں کو کیسے دل سے نکالوں گا .... یہ بھی کوئی منصوبہ معلوم ہوتا ہے .... دل میں گھر کرتا جا رہا ہے ....

اگر آپ اجازت دیں تو اسے اپنی چھاتی سے لگا لوں؟"
"چیتر بخن جی! جاؤ بابو جی کی گود میں جاؤ"۔ پربھا نے معصوم آنکھوں
سے سکھ راج کی طرف دیکھتے ہوئے بچّے کو پیار سے کہا۔
چیتر بخن کا نام سن کر سکھ راج کے بڑھے ہوئے ہاتھ پیچھے ہٹ گئے۔
"آپ نے اس کا کیا نام پکارا ہے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔
"چیتر بخن"۔
"یہ تو میرا نام ہے"۔
"اس کا بھی یہی نام ہے"۔
"اس کی عمر کیا ہے؟"
"سوا تین سال"
"جب میں پربھا سے آخری بار ملا تھا، آج اس بات کو پورے چار
سال ہو گئے ہیں ... یہی سردیوں کا موسم تھا"۔
سکھ راج کبھی بچّے کی ماں کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی بچّے کی طرف۔
"نرسی جی! میری پربھا کا چہرہ آپ جیسا ہی تھا۔ صرف اس کے ماتھے
پر کوئی نشان نہیں تھا۔ اس کی آواز بھی ایسی ہی دلکش تھی جیسی آپ کی
ہے۔ یہ میرا قصور نہیں، یہ میری بے وفائی نہیں ...... جو میں آپ سے
محبّت کرتا ہوں۔ کیا معلوم اسی کے دھوکے میں یہ دل آپ کی طرف کھنچتا

جا رہا ہے۔ کچھ کیجیے، جلدی کیجئے۔ میرے دل کے تار تن رہے ہیں۔ دیکھئے کہیں کوئی ٹوٹ نہ جائے"۔ یہ کہہ کر اس نے چتر بجن کو گود میں لے لیا۔ چتر بجن رونے لگا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ نے زیادہ زور سے کھینچ لیا"۔ پربھا نے بچّے کو اپنے گلے سے لگا کر چُپ کراتے ہوئے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، بھوکے دل میں صبر نام کی چیز ختم ہو چکی ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی، معاف کر دیجئے گا۔"

"لیکن میں اس دل کی بھوک دُور کر سکتی ہوں" یہ کہہ کر پربھا اپنے بیگ میں سے ایک فوٹو نکال لائی۔ یہ کالج کے زمانے کی ایک گروپ فوٹو تھی سکھ راج نے اس میں اپنی اور پربھا کی فوٹو پہچان لی اور اپنی ترسی کی آنکھوں میں جھانک کر بڑے غور سے دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور گلا رُک گیا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میری پربھا! یہ آپ کے ماتھے پر اتنے بڑے زخم کا نشان کیسے آیا؟ آہ! میری پربھا، میری پربھا"

"چتر بجن! میرے چتر بجن کے چتر بجن! یہ شُدنی کیسی ناشدنی ہے ملاپ کے لئے توڑتی ہے۔ جوڑنے کے لئے پھوڑتی ہے"

..ربھا!... چتر بجن!... میری پربھا جی!.... ہاں میرے چتر بجن جی!

ہندوستان میں ہندی پاکٹ بکس کا سب سے پہلا اور ملک گیر شہرت کا حامل ادارہ
ہند پاکٹ بکس
جس کا معیار ضرب المثل اور مطبوعات مقبول عام ہیں
اب ہندی کے ساتھ ساتھ اردو پاکٹ بکس کے میدان میں بھی پیش پیش ہے۔ ہمارا مقصد نہ صرف اردو کے بلند پایہ مشاہیر کے شاہکار پیش کرنا ہے بلکہ ملکی و غیر ملکی زبانوں کے مفید و مقبول گراں مایہ ادب - ناول، افسانہ، ڈرامہ، شاعری، طنز و مزاح، سیاحت، علم و سائنس، اخلاقیات، جنسیات وغیرہ — کو بھی اردو لباس پہنا کر ارزاں قیمت پر اہل ذوق تک پہنچانا ہے۔ ہماری پاکٹ بکس کا دوسرا سیٹ منظر عام پر آچکا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ پہلے سیٹ کی طرح یہ سیٹ بھی مطالعہ کے ہر تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔
۱۱ - زرگاؤں کی رانی (ناول) کرشن چندر
۱۲ - ناگ منی (ناول) امرتا پریتم
۱۳ - شام اور لڑکی (ناول) اے حمید
۱۴ - بن بیاہی ماں (ناول) گوربخش سنگھ
۱۵ - نئے شگوفے (طنزیہ خاکے) شفیق الرحمٰن
۱۶ - لال بہادر شاستری (سوانح) مہابیر ادھیکاری
۱۷ - پاکستان کا سفر (سیاحت) بلراج ساہنی
۱۸ - گیتانجلی رابندر ناتھ ٹیگور۔ ترجمہ فراق گورکھپوری
۱۹ - اردو کی بہترین رومانی نظمیں (شاعری) مرتبہ پرکاش پنڈت
۲۰ - برتھ کنٹرول (جنسیات) ڈاکٹر لکشمی نارائن
ہر کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ
ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ شاہدرہ دہلی ۳۲